دلّی والیاں
سید ضمیر حسن دہلوی

دلّی والیاں

مختصر کہانیاں

سیّد ضمیر حسن دہلوی

دلّی والیاں

مختصر کہانیاں

سید ضمیر حسن دہلوی

قیمت: =/Rs. 50

سن اشاعت: ۲۰۰۶ء

تاج پبلشرز

۱۶۶۷ بیری والا باغ دہلی ۶

طباعت: چمن انٹرپرائیزز ۱۶۰۳، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲

DILLI WALIAN

(SHORT STORIES)

By Syed Zameer Hasan Dehlavi

ISBN-81-85213-48-8
Ist Published, 2006

عزیز دوست

خلیل الرحمٰن ایڈووکیٹ کے نام

اَب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے

فہرست

مقدمہ

میری پیدائش مارچ ۱۹۴۰ء کی ہے۔ اس لئے مجھے دوسری جنگ عظیم کے ہولناک تاثرات کی ٹھٹھری ہوئی پیداوار سمجھئے۔ میرا شعور گھٹنیوں چلنے لگا تو اس نے تقسیم وطن کے بعد ہونے والے فسادات کا نظارہ کیا چنانچہ میرے مزاج میں بچپن ہی سے خوف، کم حوصلگی اور بے دلی سما گئی۔ میں خاصا بزدل واقع ہوا ہوں اور اس بزدلی کو چھپاتا بھی نہیں کہ یہ میرے احساس کی تندی اور تیزی کی دلیل ہے یارہ برس کی عمر سے میں اپنے گردوپیش سے پوری طرح باخبر ہوں۔ اتنا باخبر کہ اگر چاہتا تو شعر بھی کہہ سکتا تھا مگر یہاں میری کم حوصلگی اور تن آسانی رکاوٹ بن گئی۔ میں بنیادی طور پر جذباتی آدمی ہوں مگر میری محرومی دیکھئے کہ زندگی بھر کوئی جذباتی قدم اٹھانے کی ہمت نہ کر سکا عقل کی چنا و چنیں کا شکار رہا۔ خدا کی بزرگی اور برتری کا دل سے قائل ہوں۔ اس کی حکمتوں، تجزیوں پر نکتہ چینی کرنا میرے نزدیک عین کفر ہے اس لئے نہ دل کی بے بضاعتی اور غم کی فراوانی پر تعجب ہوتا ہے نہ اس کم ظرفی پر کڑھتا ہوں کچھ نباہ سا کر لیا ہے۔ معیشت کے لئے کاروبار وہ اختیار کیا جس میں مشقت مقرری کم ہے اور آسائشیں حتی المقدور تعلیمی زندگی سائنس اور سوشل سائنس کے میدان سر کرتی ہوئی رفتہ رفتہ مادری زبان تک آ کے رک گئی۔ تخلیقی ذوق پیدا ہوا تو اس کی تسکین کا بھی سہل راستہ ڈھونڈ نکالا۔

میں نے عرض کیا نا کہ میں "تھڑدلا" ہوں۔ یہ دلی کا محاورہ ہے۔ دشواریوں سے ڈر جاتا ہوں۔ بھاری پتھر چوما اور چھوڑ دیا۔ شاعری اس لئے نہ کر سکا کہ یہ مشکل کام ہے۔ میر، سودا، درد اور غالب کو پڑھ کے ہوش جاتے رہے۔ اللہ اللہ آدمی اس سے زیادہ اور کہہ ہی کیا سکتا ہے۔ نا بھائی میں تو وہاں تک سوچ بھی نہیں سکتا جہاں تک یہ اساتذہ کہہ کر

چلے گئے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ ایک دروازہ تو بند ہی ہوگیا۔ پھر نثر کا مطالعہ کیا۔ اس صنف میں افسانہ بہت پسند آیا۔ پریم چند اور ان کے ساتھیوں کو پڑھتا ہوا ترقی پسند افسانہ نگاروں کے گروہ تک جا پہنچا۔ یہ لوگ ان دنوں بڑے بدنام تھے۔ انکو پڑھنا میرے گھریلو ماحول میں عیب سمجھا جاتا تھا۔ والد صاحب فرماتے تھے بس نذیر احمد کی تصانیف پڑھا کرو۔ اکملت لکم دینکم اور والدہ فقط راشد الخیری کا نام لیتی تھیں۔ اللہ بس باقی ہوس قہر درویش بر جان درویش۔ ان دونوں کو پڑھا اور خوب پڑھا نتیجہ یہ ہوا کہ محاوراتی اسلوب اور دلی کا روزمرہ اوڑھنا بچھونا ہوگیا۔ آگے جو کچھ ہے سب اسی کی کارفرمائی ہے۔ یہ میری عمر کا وہ حصہ تھا جب آدمی اخلاقی مضامین اور پند و وعظ کے نام سے چڑتا ہے۔ مگر بغاوت تو میں کر ہی نہیں سکتا تھا۔ بزدل تھا، کم حوصلہ تھا اس لئے ہزاروں صفحات نصیحتوں کے پی گیا، اور ڈکار تک نہیں لی۔ اس کے بعد چھپ چھپ کر افسانے پڑھنے شروع کئے۔ منٹو کے مجموعے لایا، بیدی کے مجموعے لایا۔ کرشن چندر کے مجموعے لایا اور ان پر اخلاقی کتابوں کے گرد پوش چڑھا دیئے۔ کرشن چندر اچھے لگے ان کا رومان بہت پسند آیا۔ بیدی بالکل نہ بھائے مجھے حیاتی کیف کی ضرورت تھی اور بیدی ذرا ٹھنڈے لگے۔ منٹو دل میں گھر کر گئے۔ انہیں پڑھا تو کان گرم ہونے لگے سردی کی راتوں میں پیر لحاف سے باہر نکالنے پڑتے۔ بڑا مزا آیا۔ بلوغ کو پہونچتے وقت اور بھلا چاہیئے بھی کیا تھا میں ان کا دیوانہ ہوگیا۔ کل مجموعے پڑھ ڈالے۔ ضبط شدہ بھی کہیں نہ کہیں سے حاصل کئے اور لحاف کے اندر ٹارچ جلا کر ان کا مطالعہ کیا۔ منٹو کے بعد عصمت پر نظر پڑی۔ انہیں چھوڑا تو ہاجرہ مسرور کو پکڑا خدیجہ ذرا سنجیدہ تھیں اور میری عمر کے تقاضے غیر سنجیدہ، اس لئے ان کا ساتھ زیادہ دیر تک نہ رہ سکا مفتی عسکری بھی اچھے لگے۔ قرۃ العین حیدر ان دنوں کچھ زیادہ شہرت یافتہ نہ تھیں۔ انہیں میں نے کافی عرصے بعد پڑھا اور پسند کیا۔ ندیم بیدی کی طرح مسمسے لگے۔ البتہ اسلوب ان کا بھی رچا رچایا تھا۔ افسانہ نگاری کے اس لمبے چوڑے جہان کی سیر کرنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ ابھی میں گریجویٹ نہیں ہوا تھا انٹرمیڈیٹ ہی کرا تھا اور مضمون سائنس تھا۔ اور زبان بولنی تو آتی تھی لکھنے کا تجربہ نہ تھا۔ پھر

گریجویشن کیا تو باضابطہ ایک مضمون کی شکل میں اُردو بھی پڑھی۔ اس تعمیر میں خرابی کا یہ پہلو نکل آیا کہ اساتذۂ شعرائے اُردو کی طرح افسانہ نگاروں کے برگزیدہ گروہ سے بھی مرعوب ہوگیا۔ میں جس سے مرعوب ہوجاتا ہوں اس کا سامنا کرنے سے کترانے لگتا ہوں۔ اُردو پڑھی افسانہ نگاروں کا حقیقی مقام سمجھ میں آیا تو میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

تعلیمی سرگرمیوں سے فارغ ہوا اور تدریسی ملازمت ملی تو بڑی شدّت سے جی چاہا کہ تخلیقی کام بھی کیا جائے۔ افسانے اور شعر سے تو ڈر ہی چکا تھا۔ انشائیے کا مطالعہ کیا، مزاح نگاروں کو پڑھا، طبیعت ذرا سنبھلی۔ یہ کام نسبتاً آسان لگا۔ آہستہ آہستہ لکھنا بھی شروع کیا۔ محنت سے زیادہ داد ملنے لگی انشائیے کے ذیل میں اتفاقاً دِلّی کی مخصوص نثر بھی سامنے آئی۔ روزمرّہ تو بچپن سے کان میں پڑی تھی۔ دلّی کے روڑے تھے، جی چاہا کہ اس میں بھی کچھ لکھا جائے۔ گھٹنے پیٹ کی طرف جھکتے ہیں۔ لکھنا شروع کیا تو بس اسی کے ہوگئے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، شاہد احمد دہلوی، مُلّا واحدی، اشرف صبوحی، خواجہ محمد شفیع، مرزا محمود بیگ اور نہ جانے کن کن کو پڑھا۔ سب کی نثر یکساں تھی۔ بات ایک سی، دلی کا رونا، لب و لہجہ ایک سا، میٹھا اور مدھر ایسا کہ پڑھتے جائیے، سیری نہیں ہوتی تھی۔ خود بھی دلی کی زبان میں انشائیے لکھے، خاکے لکھے، رپوتاژ لکھے اور بزعم خود مصنف بن گئے، اوڑھی چادر موٹی برابر میں بھی سو کی خالہ ہوں، افسانے لکھ نہ سکا مگر افسانے لکھنے کی تمنا ضرور رہی۔ دو ایک ناکام کوششیں بھی کیں۔ دلّی سے دلی تک، محبت وہم یا حقیقت دو افسانے پاکستانی جرائد میں شائع بھی ہوئے مگر کچھ بات نہیں بنی۔

یہ بات ساتویں دہائی کی ہے جب مجھے بی۔ اے آنرز کو افسانہ اور اس کی ٹکنک پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ افسانے کی تاریخ کا پھر ایک مرتبہ باقاعدہ مطالعہ کرنا پڑا۔ ہیئت اور ٹکنک سے بھی کماحقہ واقفیت حاصل ہوئی اس وقت معلوم ہوا کہ عربوں کی کہاوت کہ اگلوں نے پچھلوں کے لئے بہت کچھ چھوڑا ہے غلط نہیں۔ کرشن چندر کی اسلوب پرستی کا سحر کھلا، بیدی کے افسانوں کی دھیمی آنچ کا اٹھایا۔ منٹو کی ہنگامہ خیزی اور چونکا دینے کی

کوشش نظر سے گذری۔ عصمت کی زباں کا جادو سر چڑھ کے بولا۔ مفتی کی نفسیاتی تحلیل سے آگاہی ہوئی اور عسکری کی ٹکنیکی گتھیاں سلجھانے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں انتظار حسین، اشفاق احمد، واجدہ تبسم، جیلانی بانو، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، نوید انجم اور اے حمید کو پڑھنے کا موقع ملا۔ سب کے یہاں پختگی نظر آئی۔ سب کے یہاں خامیاں ملیں حسینی کو پڑھنا اچھے لگے مگر کہانی میں کہانی پن! انکے ہاں کچھ زیادہ پایا۔ غلام عباس کا آنندی دیکھا تو جی خوش ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ نئی بصیرت رکھنے والا افسانہ نگار زندگی کے غیر افسانوی حقائق سے کس طرح کام لے سکتا ہے۔ مطالعہ کا شوق تو ہمیشہ سے تھا ہی زندگی کو جس قدر دیکھا تھا شعور اور لاشعور میں محفوظ تھی بصارت و بصیرت بڑھی تو حقائق ومشاہدات کو اکائیوں میں بدلنے کا سلیقہ بھی آگیا۔ بیدی اور ندیم پر نظر خاص پڑی پھر یہ سلیقہ نئی آگہی میں بدلنے لگا۔ موہنا لکھا تو ایک کبوتر اور تشنہ کام معمر خاتون، دو خاکوں سے ایک نفسیاتی پلاٹ پیدا کیا۔ الحاق ذات کی کہانی بنی ٹکنیکی واقفیت بڑا کام دے گئی "نقوش" میں شائع ہوئی۔ اس کہانی کو بنظر غور دیکھا جائے تو اس میں نئی اکتساب کا بڑا واضح پتہ ملتا ہے۔ ڈرتے ڈرتے یہ کہانی چھپنے بھیجی۔ کوئی یہ نہ کہدے کہ دو خاکوں کی پیوندکاری کی ہے مگر توقع سے زیادہ داد ملی۔ رام لعل کا حوصلہ افزا خط ملا ڈاکٹر محمد حسن نے کمر تھپتھپائی۔ اگلے افسانے کے لئے آمادہ کیا میری کچھ ہمت بندھی ستو النسہ شہزادہ لکھی۔ یہ کہانی موہنا کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوئی "سیپ" کے افسانہ نمبر اور لکھنؤ کے "کتاب" میں شائع ہوئی۔ دلی کی تہذیبی اور ثقافتی معلومات کام دیتی رہی۔ جنسی کجروی اس کہانی کا مرکزی خیال تھا پس منظر میں چالیس پچاس سال پہلے کی دلی تھی۔ اب کچھ کچھ اعتماد ہو چلا تھا۔ شہر کی کہانی مجھے کچھ عجیب سی لگی۔ میرے لاشعور کی پیداوار تھی "میں نے ایک عورت دیکھی" یہ بھی پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ چھپی ادارہ پرستی کے خلاف احتجاجی کہانی تھی۔

موجودہ دور کی سماجی افراتفری اس کا بنیادی خیال تھا۔ یہ کہانی بھی کافی پسند کی گئی۔ اپنے پس منظر کے اعتبار سے یہ جاگیردارانہ سماج میں عورت کے استحصال کی

کہانی تھی۔ اسے میں پہلی کہانی سمجھتا ہوں جسے ٹکنک کی جانب شعوری توجہ کئے بغیر مکمل کر گیا۔ اس کے بعد فاحشہ لکھی۔ فاحشہ ایک جرائم پیشہ مرد کی کہانی ہے اسے کتاب کے افسانہ نمبر میں جگہ ملی۔ مجرموں کی نفسیات اس کا موضوع ہے۔ میں نے اکثر کہانیاں نفسیاتی تحلیل اور تجزیہ کی مدد سے لکھی ہیں۔ اس لئے خود کو مفتی اور بیدی کا شاگرد سمجھتا ہوں مختصر سی کائنات ہے، چند کہانیاں لکھ سکا ہوں ہوا کھل گیا تو مزید کچھ لکھنے کا ارادہ ہے۔ ورنہ جب صلبی اولادیں صرف دو ہو سکتی ہیں تو معنوی اولادیں بھی چند ہوں تو کیا مضائقہ ہے۔

اُردو کہانی آج کل ایک تجرباتی دور سے گذر رہی ہے۔ میری ناقص رائے میں اس کا معیار پچھلے بیس پچیس سال کے مقابلے میں گر گیا ہے۔ تجربہ کرنا زندگی میں کچھ سیکھنے کے لئے بری چیز نہیں ہے مگر صرف تجربات کی حد تک زندگی کو محدود کر دینا بُری بات ہے۔ ہیئت کی تبدیلی بھی کوئی خاص قیامت نہیں مگر اسے منطقی اعتبار سے پختہ ہونا چاہئے۔ تجریدی فن کا بھی میں مخالف نہیں ہوں۔ مگر تجرید کے نام پر مہملیات یقیناً مذموم ہیں۔ میں خود تو سیکھیا ہوں کوئی وقیع رائے دینے کا خود کو اہل نہیں سمجھتا مگر چونکہ افسانے پڑھتا ہوں اس لئے موجودہ افسانے کے بارے میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتا ہوں زبان کی معنویت کا احساس بہت دھندلا گیا ہے۔ مجھے دلی کی نثر کے مطالعے نے اس ضمن میں بڑا حساس بنا دیا ہے غلط زبان پڑھ کے طبیعت مکدّر ہو جاتی ہے۔ زبان کہانی لکھنے کا اوزار ہے۔ آج کل زندگی کے ہر شعبہ میں روا روی ہے۔ کاتا اور لے ڈوری کا رواج ہے۔ پبلیشر مل جاتے ہیں۔ جرائد میں جگہ پانا بھی مشکل کام نہیں اس لئے زبان کی نوک پلک پر توجہ کرنا دقیانوسی حرکت سمجھی جاتی ہے۔ میں فخر سے کہتا ہوں کہ میں دقیانوسی ہوں، خراب زبان میرے حلق سے نہیں اترتی۔ کرشن چندر اور عصمت مجھے اس لئے پسند ہیں کہ وہ خوب زبان لکھتے ہیں۔

مجھے کہانی میں اچھے کردار کی تخلیق مرغوب ہے۔ کالو بھنگی، موذیل ہنگو کوچوان

پجرا بابا، بجھو پھوپھی، پرمیشر سنگھ، بابو گوپی ناتھ وغیرہ میرے پسندیدہ افسانے ہیں۔
میں کردار کی تخلیق میں افسانویت سے کام لیتا ہوں اور واقعات کی ترتیب میں حقائق سے مدد لیتا ہوں۔ مجھے انسانی نفسیات سے غیر معمولی دلچسپی ہے مگر میں نفسیات کو درسی مضمون کی طرح پیش کرنے کا قائل نہیں۔ کہانی بنیادی طور پر کہانی ہونی چاہئے اور پھر خواہ کچھ بھی ہو۔ آج کل مختصر کہانی مجھے قاضی عبدالستار کی زبان سے اچھی لگتی ہے انتظار حسین مجھے اس وجہ سے پسند ہیں کہ انہیں کہانی سنانی آتی ہے۔
کہانی میں داستانوی عنصر اس حد تک ہونا ضروری ہے کہ اسے سنا جا سکے۔
جدید کہانی سے نہ مجھے بغض للہی ہے نہ رغبت، پڑھ لیتا ہوں۔ اپنے خالی اوقات میں۔ ابھی تک یہ مجھے بحیثیت مجموعی متاثر نہیں کر پائی ہے۔ ممکن ہے آئندہ کرے۔ اگر خُرد برد زمانہ سے بچے تو۔ اس لئے میں اس سے بھی رشتہ توڑنا نہیں چاہتا۔ ترقی پسند افسانہ نگار مجھے جدید کہانی کاروں سے زیادہ پسند ہیں، مگر یہ ذاتی پسند کا معاملہ ہے۔ تنقیدی بیان نہیں۔ مجھے آج کل لکھی جانے والی ہندی کہانیاں بھی اچھی لگتی ہیں۔ ان میں کہانی کار ماحولیاتی فضا اچھی پیدا کر لیتے ہیں۔ کہانی کے لئے تنقیدی فضا کا ساز گار ہونا ضروری ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول میں پیدا ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ہندی کہانی کو فروغ ہو رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسی رفتار سے ترقی کرتی رہی تو ہندی کہانی اُردو کہانی کو پیچھے چھوڑ جائے گی، خدا نہ کرے جو ایسا ہو، اسی وجہ سے میں افسانے کے لئے تہذیبی رچاؤ اور عصری آگہی کو ضروری سمجھتا ہوں اور افسانہ نگار اس سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے صرف دلّی کے تہذیبی ماحول میں جینے کا موقع ملا ہے۔
اسی لئے میں اسی پس منظر میں کہانیاں لکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ جو کچھ لکھا ہے وہ تجربے کے طور پر ہے۔ دیکھئے آگے کیا رہتا ہے۔ دلی مٹ گئی، دلّی کی زبان قصۂ پارینہ ہوئی اب اس کے سمجھنے والے بھی کم رہ گئے۔ بتائیے کس کے لئے لکھوں۔
دہلی میرے نزدیک ایک شہر یا انسانوں کی ایک بستی نہیں ہے۔ ہزاروں سال کی ثقافتی، اخلاقی، فنّی، معاشرتی اور اعلیٰ انسانی قدروں کی جیتی جاگتی علامتی تصویر

ہے۔ میں نے اس کے دھندلے نقوش اپنے بچپن میں دیکھے ہیں اور انہیں اپنے تصوّر، ماضی کی تفتیش اور ذہنی کاوشوں سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ دلّی کا احوال میں اپنے خاکوں، انشائیوں، مضامین اور رپوتاژ وغیرہ میں بھی لکھتا رہتا ہوں البتہ کچھ باتیں ایسی بھی میرے ذہن میں ہمیشہ کھٹکتی رہیں جن کا اظہار براہ راست کرنے میں ہماری تہذیبی قدریں مانع آتی تھیں ان کے لئے ایک ایسے اشاراتی ڈھنگ کی ضرورت تھی کہ بات بھی کہی جائے، دِل بھی ہلکا ہو اور خاکِ پاک دہلی کی آبرو پر بھی کوئی حرف نہ آسکے۔ کہانیاں لکھنے کی ضرورت اسی لئے پیش آئی۔ جو تہہ داری، اشاریت اسلوب کی شائستگی آپ میرے افسانوں میں پائیں گے وہ اسی سبب خاص کی مرہونِ مِنّت ہے۔

انسانی جذبے اپنی تسکین کے لئے مناسب راستوں کے ہمیشہ متلاشی رہتے ہیں۔ ان کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ایک اچھے نظام زندگی کا فرضِ منصبی ہے لیکن ایسا ہوتا بہت کم ہے۔ تہذیبی روایات کچھ اس ڈھنگ سے زندگی پر قبضہ جما لیتی ہیں کہ آدمی کو سانس لینا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ دلی کی تہذیب میں بھی انسانی مجبوریوں کا پتہ ملتا ہے اور پھر ان مجبوریوں سے تنگ آکر جو ٹیڑھی سیدھی راہیں نکالی جاتی ہیں ان سے بعض نفسیاتی الجھنیں پیدا ہو کر زندگی کو کچھ سے کچھ بنا دیتی ہیں۔ مہذب لوگ تشنہ کامیوں پر نہ آنسو بہاتے ہیں اور نہ اپنی تمناؤں کی تکمیل کے لئے غیر مہذّب روّیے اپناتے ہیں۔ اِن کے نکالے ہوئے راستے جذبوں کو اپنی سطح سے مرتفع کر کے ایسے عمل میں ڈھال لیتے ہیں جو بد نما نہ دکھائی دے یہی بڑی تہذیبوں کا کمال ہے اور یہی ان کا عیب بھی۔

عیب بینی شرفاء کے نزدیک کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ صرف ان کے خلاف چشم سخن سے اشارہ کرنا کافی ہے۔ یہ بھی احتجاج کی ایک صورت ہے۔ میں نے اکثر کہانیوں میں نفسیاتی کجرویوں کے خلاف کنایاتی احتجاج سے کام لیا ہے۔ اِتنا سنبھل کے کہانی لکھنا بڑا مشکل کام ہے اسی لئے کہانی کے میدان میں میری تخلیقات کچھ زیادہ نہیں

ہیں۔ بہر حال اچھا بُرا، کم و بیش جو کچھ لکھا ہے اس لیے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ مجھے خود پر نہ سہی دلی پر پورا اعتماد ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں دلی کی زبان لکھتا ہوں خدا جانے صحیح یا غلط، البتہ دل یہ ضرور چاہتا ہے کہ زبان و بیان کا یہ سلسلہ آگے بھی چلتا رہے۔ نئی نسل زبان سے نابلد ہوتی جاتی ہے اسی لیے ان کے سامنے ٹوٹی پھوٹی زبان کا یہ نمونہ چھوڑنا چاہتا ہوں تاکہ وہ اسے مزید فروغ دیں۔ تعصبات کا زمانہ ختم ہوا۔ اردو اب ایک بین الاقوامی زبان ہے۔ ہر جگہ اس کا اپنا بیانیہ ہے۔ مقامی اسلوب ہے، رنگا رنگی ہے، بوقلمونی ہے اسی سے اُردو کا وقار، اُردو کی عظمت اور اس کی مقبولیت قائم ہے۔ میں اُردو کے اس رنگا رنگ اظہار و بیان کو تسلیم کرتا ہوں اس کی اہمیت سے واقف ہوں لیکن ساتھ ساتھ یہ تمنّا بھی رکھتا ہوں کہ زبان کا جمہوری طرز جیسے دلّی والوں نے اپنایا تھا آگے بھی برقرار رہے اس کے محاوراتی اسلوب، گفتگو کے انداز، سادہ اور سہل طرز بیان کی بھی آبیاری ہو تاکہ اجڑے دیار کی روایت تاریخ کے صفحات پر ہی نہیں ہمارے آپ کے دلوں میں بھی زندہ و پائندہ رہے۔

جگ میں ضمیر تمہارے دم سے اُجڑے دیار کا چرچا ہے
ورنہ اس کے چاہنے والے، کب کے قبرستان گئے

سیّد ضمیر حسن دہلوی

میر تفضل حسین کی کھڑکی کے پاس جو چماروں کا چھتہ تھا اس کے قریب ہی دو تین بوسیدہ سی دُکانیں، اللہ بخشے دادا ابّا مرحوم کی تھیں۔ ان دکانوں کو غالباً سدا سے رہائش کے لئے ہی استعمال کیا جاتا تھا اور سچ پوچھیے تو دُکانداری کا یہاں موقع بھی نہ تھا۔ بہت مختصر سی آبادی اور وہ بھی فقط اِن لوگوں کی جنہیں بیشتر ضروریاتِ زندگی جنس کی شکل میں اپنے ججمانوں کے گھروں سے مِل جاتی تھیں، پھر ایک بات یہ کہ جگہ بھی کچھ اندھیری اندھیری سی تھی۔ ہم جیسے کمزور دل آدمی کو اگر کوئی لاکھ روپے بھی دے تو سچ جانیئے، جھٹ پٹے کے بعد ادھر کا رُخ نہ کریں۔ اس جگہ کے متعلق کئی سنسنی خیز روائتیں بھی مشہور تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ ان دُکانوں کے بائیں طرف جو بڑا سا نالہ تھا۔ وہ ایک نکٹے بھتنے کا مسکن تھا۔ چاندنی راتوں میں جب نو عمر لڑکے پالے کا میدان جماتے تو یہ مردار بھی نالے سے نکل انکے ساتھ کھیل میں شامل ہو جاتا تھا۔ گھنٹوں کھیلتا رہتا تھا پر کیا مجال جو کسی کی گرفت میں آئے۔ اچھے اچھے پہلوان چھوکرے ہانپتے ہانپتے نڈھال ہو جاتے تھے لیکن اس کم بخت کو زیر کرنے کی حسرت ہی رہ جاتی تھی۔ جہاں کسی نے کولی بھری اور وہ یوں نکل گیا جیسے ہوا کا جھونکا ہو۔ ہاں اگر دو تین مل کر لپٹ گئے تو وہ موری میں گھُس کر غنغنانے لگتا تھا، پھر بھلا کون جی دار تھا کہ سامنے ٹکتا۔ ذرا دیر میں میدان صاف ہو جاتا تھا۔ خدا جانے سچ یا جھوٹ ہم نے تو یہاں تک سُنا تھا کہ اس بھتنے نے کئی راہ گیروں کی جانیں بھی لے لیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ نکٹا بھتنا آدمی کا کلیجہ کھاتا تھا۔

خیر یہ سب باتیں تو اب پرانی ہو گئیں۔ نہ وہ نالہ رہا نہ اندھیرا چھتہ۔ نہ چھتے کے بسنے والے چمار۔ اَب تو اس جگہ بڑی بڑی کشادہ گلیاں ہیں۔ دائیں بائیں خوب صورت، پختہ اور گنجان آباد مکانات، نیچے گودام، دکانیں، غرض سولہ سترہ سال کی لوٹ پھیر میں دنیا بدل گئی۔ البتہ یہاں کے رہنے والے بتاتے ہیں کہ رات گئے ایک سر کٹا بھتنا اب بھی اس علاقے میں چکر لگاتا ہے۔

سُنا ہے کہ آدھی رات سے پچھلے پہر تک اس کا سر سامنے والے چوراہے کے بیچوں بیچ دکھائی دیتا ہے۔

انگنا کہار اسی چوراہے کے نزدیک کا کن بساطی کے سامنے ایک چھوٹی سی دُکان میں رہتا تھا۔ کہار کا پیشہ تو اس نے کافی دِنوں پہلے ہی چھوڑ دیا تھا جب ہاتھ کی رکشا چلنے پر ڈولیاں بالکل بے کار ہو گئی تھیں۔ البتّہ ایک پرانی ڈولی دکان کے باہر بڑی سی پھول دار کیل میں ہمیشہ لٹکی رہتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے میوزیم میں پرانے زمانے کے آلاتِ حرب لٹکے رہتے ہیں۔ انگنا کی گذر اوقات اَب مدّت سے ان گھروں کے لین دین پر تھی جن کے دروازوں پر عمر بھر اس نے "ڈولی آگئی ہے" کی صدا لگائی تھی۔ سستا زمانہ، دیالو اور وضعدار لوگ، بے چارہ انگنا لشتم پشتم زندگی کی گاڑی گھسیٹ ہی لیتا تھا۔ میرے بچپن میں اس کی عمر کوئی ستر بچھتّر برس کی ہوگی۔ ہڈیوں کی ساخت جوانی کی توانائی کا پتہ دیتی تھی اور اس بڑھاپے میں بھی محلے کے اکثر گھرانے اس کے خدمت گذاریوں کے ممنون احسان تھے۔ کسی کا سودا سلف لا دیا۔ کسی کے گھر کی چوکسی کی۔ کسی کا حصّہ بخرا پہنچا دیا۔ بوڑھوں اور بیماروں کے لئے پرانی ڈولی کیل سے اُتار اپنے کسی بھائی بند کو ساتھ لے فوراً حاضر ہو جاتا تھا۔ زندگی کا آخری حصّہ انگنا نے خدمتِ خلق اور دین دھرم کے لئے وقف کر دیا تھا۔ جو وقت لوگوں کی ہانک پکار سے بچتا وہ گیتا کے پاٹھ میں لگا دیتا تھا۔ منگل بر ہسپت اور شنی وار کو جوگیا لباس پہن ایک بڑی سی مالا ہاتھ میں لے نہ جانے کیا کیا جپتا رہتا تھا۔ لیکن اگر اس وقت بھی کوئی ضرورت مند بلانے آجاتا تو مالا زمین پر رکھ آسن توڑ اس کے ساتھ ہو لیتا تھا۔ پہلے انسانوں کی خدمت کرتا تھا پھر بھگوان کی پُوجا۔

انگنا ایک کہار تھا اور کہاروں میں ہم نے آج تک گورا تو گورا، سانولا بھی نہیں دیکھا۔ سب ایسے کالے بھجنگ ہوتے ہیں جیسے کولتار کے مجسّمے۔ انگنا بھی اماوس کی رات کی طرح سیاہ تھا۔ خوب پختہ جیسے اُلٹا توا، ہاں چمک دمک بلا کی تھی۔ اسکی جلد پر ہمیشہ ایک تازگی رہتی تھی جیسے گھنٹوں تیل کی مالش کی گئی ہو سیاہ فراخ ماتھے پر جب وہ صندلی تلک لگاتا تو یوں لگتا تھا جیسے مشکی گھوڑا سنہری ساز پہنے کھڑا ہو۔

جو گیا لباس جو وہ اکثر پوجا پاٹھ کے سمے پہنتا تھا اس کے جسم پر ایسا کھلتا تھا جیسے چاند کی کرنیں جاڑوں کی ٹھنڈی رات میں جگ مگ کرتی ہوں یا پہاڑ کی سیاہ وادیوں میں زعفران کے کھیت مسکرا اُٹھیں۔

چوڑا طباقی چہرہ، کھلی ہوئی چمکدار پیشانی، ابھرا ہوا گول مول سر جس پر چاروں طرف سفید چھدرے بالوں کی ہلکی ہلکی جھالر۔ قلمیں گالوں کے وسط تک بڑھی ہوئی جن میں ایک مصنوعی اُریب دیا گیا تھا، دہانہ ذرا بڑا مگر اس کا زائد حصّہ گل مچھوں سے ڈھک گیا تھا۔ جن پر سر کے بالوں کی طرح بڑھاپے کی برف گر چکی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں چمکدار، موتی کی مانند شفاف ان میں کاجل کے لمبے لمبے ڈورے، سُرخ اور ذرا سوجھے ہوئے پپوٹے سفید جٹواں بھویں جو ناک کے اُوپر ایک دوسرے سے مل گئی تھیں آنکھ اور ناک کے درمیاں اُبھری ہوئی ہڈی کے پاس ایک بڑا سا رامسّہ کوئی مٹر کے دانے برابر، سیاہ رنگ کا اس میں دو چھوٹے چھوٹے سفید بال مسّے کے قریب ہی ناک کی پھننگ، پھلکی کی پھلکی۔ بڑے بڑے کشادہ نتھنے جو ہر سانس کے ساتھ پھیلتے اور سکڑتے تھے۔ ناک کا اُوپری حصّہ آنکھوں کے درمیان خم آلود۔ ایسا ٹیڑھا میڑھا جیسے املتاس کی پھلی۔ دانت اگر ہوں گے تو زیادہ چھ سات اور وہ بھی اتنے اندر کہ ان تک نظر کا پہنچنا محال تھا۔ البتہ ہونٹ گھنی موچھوں کی چلمن سے ہر وقت اپنے وجود کا اعلان کیا کرتے تھے۔ نیلے نیلے گُردے کے گُردے۔ آگے سے یوں مڑے ہوئے جیسے کونڈے کے کنارے اور نچلا ہونٹ عام طور پر لٹکا رہتا تھا۔

چوڑا چکلا، بھرا بھرا سینہ، اس پر اتنے بال جیسے دیسی کمبل پر کھڑا کھڑا رُواں، بدن پر گہرے رنگ کی بنڈی، دونوں طرف جیبیں لگی ہوئی۔ ایک جیب میں بڑا سارا کپڑے کا سِلا ہوا بٹوا، دوسری میں ایک چھوٹی سی کتاب، بھگود گیتا جسے ہم ان دنوں ہندوؤں کا قرآن شریف کہتے تھے۔ بازو آدھے آدھے کھلے ہوئے جو کبھی سخت صحت مند اور سڈول رہے ہونگے۔ کہنی کے جوڑ نمایاں چپٹی چپٹی چوڑی چوڑی کلائیاں اُنگلیاں اُوپر سے کالی اندر سے سفید، کچھ کچھ پیلاہٹ لئے ہوئے، ہتھیلی کی کھال

ایسی کہ جیسی بھینس کی چمڑی، ٹانگوں میں ایک میلی سی دھوتی، گھٹنوں سے ذرا نیچی، پیچھے سے اُڑسی ہوئی۔ جہاں دھوتی اڑسی جاتی تھی وہاں کمر میں خاصی گہری نالی سی بنی ہوئی پنڈلیاں، ان میں ہلکے ہلکے خم جو غالباً ڈولی اُٹھانے کے باعث پڑے ہوں گے۔ کدال جیسے پیر۔ اُنگلیاں انگوٹھے کی مخالف سمت میں کافی مُڑی ہوئی جس سے بڑی اُنگلی اور انگوٹھے کے درمیان ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ غرض یہ کہ انگنا کہار کسی کونے سے بھلا لگنے کے لائق نہ تھا۔ نرا بھوت ناتھ، کالا پیلا، بدشکل، بدوضع لیکن اگر تاثیر کی بات کریں تو اس نے بڑی دلکش اور جاذب نظر شخصیت پائی تھی۔ اس کا سراپا مکمل ایثار، اُنس اور محبت کا سراپا تھا۔ اس کی نرم نرم گفتگو سننے والوں کے کانوں میں رس گھولتی تھی۔ کہتے ہیں انسان کی شکل پر اس کے اعمال کا عکس پڑتا ہے سو انگنا کی صورت بھونڈی اور بھدی ہونے کے باوجود اس کی روحانی پاکیزگی سے جگمگاتی رہتی تھی۔

انگنا سے میرا تعلق محض رسمی نہیں ہے بلکہ مجھے اس کی ذات سے ایک جذباتی لگاؤ ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو انگنا کو اپنی ڈیوڑھی پر کھڑا پایا۔ میں انگنا کی گود میں کھیلا ہوں۔ میں نے اس کی مونچھ کے بال نوچے ہیں۔ اس کی گنجی چندیا پر سیکڑوں چپت لگائے ہیں۔ میں انگنا کو بھول ہی نہیں سکتا۔ وہ میرا پہلا دوست، پہلا غمگسار، پہلا دمساز تھا۔ اس نے میری اس درجہ خدمت کی ہے کہ میرا رواں رواں اس کا احسانمند ہے۔ میں رویا تو اس نے مجھے ہنسانے پر اپنی ساری قوت صرف کر دی۔ میں ہنسا تو اس نے میرے ساتھ مصنوعی قہقہے لگائے۔ میں کھیلا تو وہ بھی میرے ساتھ بچوں کی طرح کھیلنے لگا۔ میں گر پڑا اور میرے چوٹ لگی تو وہ گھنٹوں تڑپتا رہا۔ میری تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر نظر آتے تھے۔ بلبلا بلبلا کے پوچھتا تھا "چوٹ تو نا ہی لگی سرکار" میں نے جو خلوص جو ہمدردی، جو محبت اور ایثار انگنا میں پایا وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہو گا۔

۱۹۴۷ء میں بٹوارے کے بعد جب فسادات ہوئے تو انگنا بے چارہ قریب المرگ تھا۔ تندرست اور توانا جسم گھُل گھُل کے نزار ہو گیا تھا اور اعصابی اضمحلال نے اس میں ہلنے جلنے کی سکت کم چھوڑی تھی۔ کوٹھری میں پڑے ہوئے اندھے، بہرے اور مفلوج انگنا کو باہر کے شور شرابے کا علم ہی نہ ہوتا لیکن جب سر سیتارام اپنی حویلی مقفل کر، محلے کو خیر باد کہہ گئے اور باگڑ و بنئے نے بھی اپنے بال بچوں کے ساتھ قیمتی اسباب لے کسی ہندو علاقے میں جانے کا فیصلہ کیا تو محلے کے شرفاء نے انگنا کے کان میں بھی ساری بات ڈال دی اور صاف صاف کہہ دیا کہ کل کلاں کو خدا نخواستہ اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو ہم ذمّے دار نہیں ہیں۔ ہماری مانو تو تم بھی کسی دوسری جگہ چلے جاؤ۔ انگنا غریب کو اول تو حالات کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ دوسرے وہ عمر کی اس منزل سے گذر رہا تھا۔ جہاں پہنچ کر آدمی کے ہر سانس سے یہ صدا آنے لگتی ہے کہ اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے۔ چنانچہ اس نے لوگوں کے مشورے کو کان دھر کے سُنا تک نہیں۔ آنکھیں کھول کر اپنے ججمانوں پر نظر ڈالی اور بولا "یہاں سے سرکار اب ہمری لہاس ہی جائے گی، سگلی عمر آپ لوگن کی سیوا میں ہی گذار دی، اب ہم کون جگہ جائی سکت ہیں۔ ہم کو کون ماردئی گا ہجور، آپ سب ہمری گو دین کے کھلائے ہیں" لوگوں نے سوچا بات تو ٹھیک ہے انگنا میں اَب رکھا ہی کیا ہے جو کوئی اس کا خون اپنے سر لے گا لہٰذا بہت اصرار نہیں کیا، خاموش ہو کر لوٹ آئے۔

حالات بگڑتے گئے۔ شہر کی فضا دن بدن خراب ہونے لگی نظم و نسق برقرار رکھنے کے لئے فوج طلب کر لی گئی۔ دن رات سڑکوں پر مسلح دستوں کا گشت ہونے لگا، محلے کے محلے خالی کر کے لوگوں نے عرب کی سرائے میں ڈیرے ڈال دئے۔ جمعرات کو وہاں سے اسپیشل چھوٹتی تو سینکڑوں لوگ وطن سے دُور انجانے ملک کی طرف کوچ کر جاتے تھے۔ پھر خالی گھروں میں اردگرد کے پناہ گزین آن کر بس گئے۔ لوگوں نے ان کا دم غنیمت جانا کم از کم کچھ چراغ تو روشن ہوئے

بھائیں بھائیں کرتے محلّوں میں انسانوں کی صورتیں تو دکھائی دیں، گلی کوچوں کے نکڑ پر حفاظت کے لئے آہنی دروازے اور پھاٹک چڑھا دیئے گئے۔ اِن ساری تدبیروں کے باوجود ہر روز شام کے وقت آسمان سُرخ ہو جاتا تھا، چاروں طرف آگ کے شعلے لپکتے تھے سڑکوں پر بے گوروکفن لاشیں پڑی ملتی تھیں۔ مذہبی جنون جو دوسرے تمام جنونوں سے بازی لے جاتا ہے تمام انسانی معاشرے پر حکمرانی کر رہا تھا اور اس کی حکومت میں دُنیا جہنم بن گئی تھی۔

ایک دن دوپہر کے وقت رستم خاں چوکیدار بمعہ اپنی ڈاڑھی کے جسے وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، دریا گنج کے ڈپو پر محلے والوں کے لئے اناج لینے گئے تو انہیں فسادیوں نے گھیر لیا۔ پہلے تو اس آفندی پٹھان نے مقابلہ کیا لیکن جب دیکھا کہ سارا جسم زخموں سے چور ہو چکا ہے اور سیروں خون بہہ گیا ہے تو لاش کی بے حرمتی کے خوف سے گھر کی طرف بھاگ لیا اور محلے والوں کی گود میں فسانۂ جورِ فلک سناتے سناتے دم توڑ دیا مجھے آج تک یاد ہے کہ جب میں نے اسے دیکھا تو جی چاہا کہ ساری دنیا کو آگ لگا دوں۔ کوئی چالیس پچاس کاری زخم اس کے جسم پر لگے تھے جن سے ٹپک ٹپک کر جیتا جیتا خون بہہ رہا تھا۔

رستم خاں چوکیدار کی حسرت ناک موت نے علاقے والوں کے ذہن ماؤف کر دیئے۔ ظلم کا جواب ظلم سے دینے کے منصوبے بننے لگے۔ مجاہدوں کی پُرجوش تقریریں ہوئیں۔ اِسلامی غیرت اور حمیت کو للکارا گیا۔ بہادروں نے بزدلوں کو شرمسار کیا۔ ہتھیار جمع کئے گئے اور ان تمام باتوں کے بعد فیصلہ ہوا کہ اجتماعی جتھے بنا کر قریب کی ہندو آبادیوں پر یورش کر دی جائے۔ کچھ دیر پہلے جو لوگ رستم خاں چوکیدار کے بہیمانہ قتل اور قاتلوں کی درندگی پر طعنہ زن تھے اَب وہ خود بھی اِن ہی حرکتوں پر آمادہ ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔ انصاف کی میزان برابر رکھنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا۔

جب بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کا سوال اُٹھا اور پہلے مورچے یعنی باہر

ٹھلتی ہوئی فوج کے سامنے ڈٹنے کے لئے غازیوں کی تلاش کی گئی تو سب کی گردنیں ڈھلک گئیں، جوش و خروش سرد ہوا اور دلوں پر اوس پڑ گئی۔ آخر ایک گروہ نے دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کر فضل دین بدمعاش کی قیادت میں کھڑکی تفضل حسین کا رُخ کیا۔ لوگ سمجھے غالباً یہ پٹودی ہاؤس پر وکٹوریہ ہسپتال کی جانب سے ہلّہ بولیں گے لیکن کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے جھگڑا گھر کے اندر ہی نمٹا دیا ہے۔

سنا ہے دو آدمی سہارا دے کر انگنا کہار کو اس کی قبر جیسی کوٹھری سے باہر لائے اور فضل دین بدمعاش نے اپنا رامپوری چاقو اس کے جھریوں بھرے پیٹ میں اُتار دیا۔

اگلے دن محلے کے سارے شریف گھرانے پاکستان جانے کے لئے کرائے کی موٹروں میں سوار ہو کے ہمایوں کے مقبرے کے پاس عرب کی سرائے میں جا پڑے۔

موہنا

پھوپی جمیلہ کے میاں ستّر کے پیٹے میں تھے اور وہ خود پچاس یا پچپن برس کی ہو گی مگر تھیں بڑی ٹھاٹھی، خوب چوڑی تختہ سی کمر، بھرے بھرے کولہے اور چہرے پر لہو موجیں مارتا تھا۔ پہنّے اوڑھنے کا ایسا شوق تھا کہ جب دیکھئے مانڈھی چڑھے سفید بُرّاق کپڑے پہنے جھل مِل جھل مِل کرتی پھر رہی ہیں خوشبوئیں ان کے جسم سے پھوٹی پڑتی تھیں ماشاءاللہ خُوب کھائے پئے تھیں اور اَب بھی جب تک جاڑے رہتے دن رات سٹر پٹر کئے ہی جاتی تھیں۔ کبھی ہلدی کا حلوہ بنالیا کہ ہڈیوں کو مضبوط کرے گا۔ جہاڈیں پڑیں تو حلوا سوہن کا کڑھاؤ چڑھا کہ بدن میں گرمی آئے گی۔ کچھ نہیں تو صبح چار انڈے توڑ ذراسی کھانڈ مِلا خورجے کے دیسی گھی میں بھون لئے۔ انڈوں کا حلوہ تیار ہے۔ معدہ بھی ان کا اچھّا جاندار تھا۔ دِن بھر کی چکھا مکھی کے باوجود میاں کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھتیں تو دو رومالی روٹیاں کھالیتیں جو گمٹی دار بڑے سے جہازی توے پر خاص طور سے اپنے لئے کشمشی چتّی کی پکاتی تھیں۔ ذرا تو تیز ہوا اور روٹی سینک کر کلونس کھا گئی تو انہوں نے چپکے سے دستر خوان میں سب سے نیچے رکھ لی اور کھاتے وقت آہستہ سے میاں کے آگے کھسکا دی۔ میاں یوں تو جتنی دیر گھر میں رہتے کچھ نہ کچھ بڑبڑائے جاتے تھے ایک منٹ زبان تالو سے نہیں لگتی تھی مگر کھاتے وقت بولنا ایسا حرام سمجھتے کہ خواہ کنکر پتھر سامنے رکھ دو اللہ کا شکر کر کے حلق سے نیچے اُتار لیں گے۔ بے چارے سہتر بہتر ہو گئے تھے نہ منہ میں

دانت تھا نہ پیٹ میں آنت۔ گھنٹوں تو نوالے کو ایک کلّے سے دوسرے کلّے میں لے جاکے نرم نرم مسوڑھوں سے خوب گھلاتے رہتے جب ذرا گداز ہوتا تو سارس کی طرح گردن اُٹھا ثابت ہی سٹک جاتے تھے۔ بے چاروں کو مزا تو خاک نہ آتا۔ ساری ڈاڑھیں گر چکی تھیں۔ زبان پر جگر کی خرابی سے سفید سفید پیٹری جمی رہتی تھی اور ذرا منہ چلاتے تو رال نکل کر داڑھی پر یوں بہنے لگتی تھی جیسے منہ میں کچّا انڈا پھوٹا ہو۔ کھانا کیا کھاتے بس زہر مار کرتے تھے۔

پھوپی جمیلہ کے میاں سدا کے ایسے نہ تھے۔ سنا ہے جوانی میں ان کا تیہا چڑھتا تو پھد پھد چلنے والی بیگم بیری کی طرح کانپتی تھیں۔ اب بھی کبھی کبھی اپنی سال خوردہ ٹمٹم جلتے چراغ ایسی آنکھوں کا رعب ڈالتے تو پھوپی کا بسنتی رنگ پھیکا پڑ جاتا تھا۔ وہ تو یہ کہو کہ ذرا دیر میں موتیا بند ان آنکھوں میں ستارے بن کے جھلملانے لگتا تھا جو پھوپی کی جان چھوٹتی تھی۔ خوب چوڑے چکلے آدمی تھے۔ اپنے زمانے میں بڑے وجیہہ اور شان و شوکت کے مرد رہے ہونگے غموں نے کمر توڑ دی تھی ورنہ وہ اتنے جلدی ڈھنے والے نہ تھے انہیں پیسے کوڑی کا غم تو تھا نہیں۔ موروثی جائدادیں تھیں۔ منشی گیا اور کرایہ اگا لایا۔ البتہ بڑھاپے میں کمر تھامنے والا کوئی نہ تھا۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگہا زندگی بھر لوگوں نے مشورے دئے کہ میاں دوسری شادی کر لو تا کہ تمہارا نام لیوا اور پانی دیوا تو پیدا ہو مگر وہ اس لئے راضی نہ ہوئے کہ پھوپی کے دل پہ میل آئے گا۔ مثل مشہور ہے کہ عورت کے آنسو دودھاری تلوار سے بڑا ہتھیار ہیں۔ پھوپی کے سامنے ذکر آتا تو وہ دو ٹسوے بہا اِن کے دل سے اس خیال کو دھو ڈالتی تھیں۔ پھوپی جمیلہ کی سوڑھ تو ایسی سوکھی تھی کہ کچے پکّے یا ستوانسے اٹھوانسے تک نہ ہوئے کہ خود پیٹ کی آگ کا مزا چکھتیں اور میاں غریب کو ذرا آس تو بندھتی۔ ادسوں پیاس نہ بجھے مگر دل تو ٹھنڈا ہوتا ہے۔ پیٹ میں چیونٹے کی گانٹھ لگی تھی۔ موئے آسیبی مکان کی طرح ان کی کوکھ سدا ویران ہی رہی اور وہ خود اجاڑ بستی کا دیا بن کر بھائیں بھائیں کرتے مکان میں اکیلی بیٹھی ٹمٹمایا کرتی تھیں۔

پھوپی کا مکان بھی ایک پوری حویلی تھا۔ نیا آدمی تو دہل کے مر جائے جوانی میں جب ان کے میاں آدھی رات تک غائب رہتے تھے تو وہ بڑے سے

نواڑی پلنگ پر بیٹھی گھر میں پھرتے سفید سفید سایوں کو دیکھ ہولتی رہتی تھیں ۔ مگر پھر بعد میں عادت سی ہو گئی ۔ بڑے بڑے گھدار کمرے ۔ ان سے متصل دالان ، سہ دریاں صحن چبوترہ بیچ میں بڑا سارا حوض ، دیوار دیوار کیاریاں ، شریفے کے درخت جن میں لالوں اور پدڑیوں کے پنجرے لٹکے رہتے تھے ۔ تعمیر خاصی پرانی تھی ۔ لکھوری اینٹ اور چونے کی چنائی تھی ۔ جہاں جہاں سے چونا جھڑ گیا تھا چڑیوں نے کرید کرید کر گھونسلے بنا لئے تھے ۔ صبح جب دو گنتی کی پانچ روٹیاں پکاتیں تو باورچی خانے میں چڑیوں کی بارات سی آ جاتی تھی ۔ چیں چیں کر کے سارا گھر سر پہ اٹھا لیتی تھیں پھر وہ کونڈا دھو کے ڈھیر ساری مروڑیاں آنگن میں ڈالتیں تو یہ فوج پھر پھر کرتی ٹڈی دل کی طرح کھانے پر گر پڑتی تھی ۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ۔ میں نے تو پھوپی جمیلہ کا ذکر اس لئے کیا تھا کہ وہ موہنا پر جان دیتی تھیں ۔ ذرا دیر نظروں سے اوجھل ہوتا تو بسم اللہ کے گنبد میں ہلنے والی پھوپی سیدھا برقعہ سر پہ رکھ سارا محلہ چھان مارتی تھیں ۔ کنوؤں میں بانس ڈلوا دیتیں اور گھر گھر ڈھونڈتی پھرتی تھیں ۔ پہلے سارے محلے میں اُنکا پردہ مشہور تھا ۔ مرد کا تو ذکر ہی کیا گھر میں غیر عورت تک نہ جاتی تھی ۔ کبھی حکیم کو نبض نہیں دکھائی کہ گوری گوری کلائی نامحرم کے ہاتھ میں جائے گی ۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے مگر اب یہ عالم تھا کہ سر جھاڑ منہ پہاڑ موہنا کے پیچھے دیوانی سی پھرا کرتی تھیں ۔ لوگ کہتے انہیں مالیخولیا ہو گیا ہے بھلا دو پسلی کا کبوتر اور یہ ہیں کہ اس کے پیچھے جان ہلکان کئے پھرتی ہیں ۔ اب کسی کو کیا معلوم تھا کہ پھوپی نے اسے کس طرح پالا تھا سب تو یہ سمجھتے تھے کہ جیسے ان کی سہ دریوں کے نچلے چوکوں کے درمیان سینکڑوں جنگلی کبوتر رہتے ہیں اسی طرح موہنا بھی رہتا ہے بات یہ ہے کہ موہنا کی کابک ان کے اپنے دل میں تھی ۔ بس چھاتی سے دودھ پلانے اور پوتڑے دھونے ہی کی کسر رہ گئی تھی ورنہ اُنھوں نے موہنا کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا ۔ موہنا کا باپ تو اس ننھی سی جان کو بیچ منجدھار میں چھوڑ کر آسمان کی جانب اڑ گیا

تھا۔ پھر ماں ڈھڈّو نے بھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ بیسوا بن جنگلیوں میں رہنے لگی۔ پھوپی نے کابک میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو لال لال گوشت کی ننھی سی بوٹی نبض کی طرح دھڑک رہی تھی۔ گلگلا گلگلا جسم ہتھیلی پہ رکھ کے دیکھا تو پوٹے میں فقط ہوا بھری تھی اور گرم ایسا تھا کہ پھوپی کے سارے وجود کو گرما دیا۔ انھوں نے اپنے پوپلے منہ سے دانہ چبا کے اس کی چونچ میں اُتارا تھا۔ دوپٹے کے آنچل سے پانی کے قطرے ٹپکائے تھے جب خُدا خُدا کر کے یہ زیر دن سے شیر ہوا تھا۔ اب یہ اس کی فطرت کا تقاضہ کہیئے یا احسان فراموشی کہ پل پلا کر بڑا ہوا تو پھوپی کو ٹھینگا دکھا سارے شہر کے تاوے کاٹنے لگا۔

موہنا ذرا بد معاش تھا۔ جوان خون رگوں میں لاوا بن کر مچلتا تو اسے دور کی سوجھتی تھی مگر جہاں پیٹ میں آگ لگی اور وہ بر جوڑ سیدھا پھوپی کے آنگن میں کود پڑتا۔ پھوپی صبح صبح ایک موٹی سی ٹکیا گھی ہلا کھائی میں سینک لیتی تھیں۔ پاپڑ اتار اپنے لئے شوربے میں بھگوتیں اور نرم نرم نیچے پکے آٹے کو مسل کر جو کی شکل بنا ایک مٹی کے پیالے میں موہنا کے لئے رکھ لیتی تھیں۔ جب موہنا آتا تو ایک ایک کر کے اسے اپنے ہاتھ سے کھلاتی تھیں۔ وہ گردن نچا نچا کے خوب تہہ پر تہہ جماتا اور سوندھی سوندھی کنڈ ساتی سے ٹھنڈا پانی پی چمست ہو جاتا تھا۔

سامنے دلاور میاں کی کنگنی تھی۔ تاصی اونچی اور کشادہ اسے مجھ آذار نے بنتوں نے سرائے بنایا تھا محلے کے جتنے نکھرے ندھرے کبوتر تھے سب یہاں آبیٹھتے۔ دن بھر ادھر اُدھر جلوے مانڈے اڑاتے اور رات کو اس منڈیر پر آن بسیرا کرتے تھے پروں میں چونچ دیئے اپنے اپنے کونے میں پڑے رہتے تھے۔ البتہ شام کے وقت جب ایک دوسرے کی جگہ ہتھیانا چاہتا تو بڑی لڑائیاں ہوتی تھیں ایک سے ایک بڑا بد معاش تھا۔ کسی نے کسی کا گھٹا بھر لیا تو کوئی کسی سے دست و گریبان ہے موہنا کا باپ اللہ اس کی روح کو قرار دے، جتنے دلوں زندہ رہا، اس نے منڈیر پر چاکے سفو کا نک نہیں۔ وہ غریب تو فرشتہ تھا فرشتہ۔ بس اپنا گھر بھلا اور آپ

نہ کوئی دوست نہ آشنا، نرا اللہ میاں کی گائے گھر گھسنا، خاموش۔ جب کبھی سیر تفریح کو جی چاہتا تو فراٹے بھر ذرا دیر میں تارا بن جاتا تھا اور پھر تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اونچی فضاؤں میں کوئی نقطہ تیر رہا ہو۔ اتنا بلند کہ عام آدمی کی آنکھ کو تو سوجھنا محال تھا۔ البتہ کبوتر باز بھی دس بیس سکنڈ ٹکٹکی باندھ کے دیکھے تو پتلیاں پسیج جاتی تھیں۔

موہنا کا باپ لاکھوں میں ایک تھا۔ پھوپی جمیلہ کے ایک دور پرے کے عزیز تھے۔ غلام کبریا جوتے والے۔ وہ ایک دن اسے اپنے ساتھ لائے تھے اور پھوپی کے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ ہوا یہ کہ ان کی ٹکڑی میں اس کا میل نہ تھا ورنہ سچ پوچھئے تو ایسا ہیرا کون کسی کو دیتا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ وہ گولے اڑاتے تھے جو بمبار طیاروں کی طرح چھتوں چھتوں گذرتے مگر طرار ایسے کہ ایک ایک ہوا میں پرائی ٹکڑی کے دو دو تین تین پر کھینچ لاتے تھے۔ موہنا کا باپ نہ جانے کہاں سے ایک دن ان کی چھتری پہ آن بیٹھا۔ وہ اس وقت مٹی کی نئی کنڈھالی میں ہڑ کھس رہے تھے۔ اب جو ہڑ کھس کے انہوں نے قلعی دار تانبے کے لوٹے سے دھار باندھی تو یہ لوٹ کے نیچے گرا۔ میاں غلام نے باجرے کی ہنڈیا اٹھا چاروں طرف چھڑکاؤ کر دیا اور یہ بے چارہ دانہ کھا کے ایسا لدھڑ ہوا کہ جھٹکے کا ایک وار بھی نہ سہ سکا۔

پھوپی غریب عورت ذات اس کی جوڑ کی مادہ کہاں سے لاتیں۔ وہ اصل نسل کابلی تھا۔ ذات کا سچا، بالکل سفید، جیسا برسات میں چودھری کرن سنگھ کی بھینس دودھ دیا کرتی تھی۔ موتی جیسی شفاف آنکھ اور دائرہ بالکل صاف ہیرے کی کنی ذرا سُرخی کا نام نہیں۔ اس پر کمال یہ کہ اکیس پر۔ بڑے جاندار چار کے بجائے چھ چھ کلیاں اور چھاج کی چھاج دم۔ جبھی تو یہ عالم تھا کہ باز، بہری، شکرہ جو چاہے پیچھا کرے اس کی جوتی کو پرواہ تھی۔ ڈھڑا دھڑ قلابازیاں کھاتا اور کہیں کا کہیں جا پہنچتا تھا۔ دیکھنے والا سمجھتا کوئی تارا ٹوٹا ہوگا۔ گھر سے دو دو دن غائب رہنا اور مجال کیا کہ کہیں پنجے ٹکائے ہوں۔ شرمیلا اس قدر کہ جب پہلے دن بڑی مشکل سے

تلاش کر کے ایک مادہ کو پھوپی نے اس کے ساتھ کابک میں چھوڑا تو وہ کونے میں گھس گیا اور ساری رات سناٹے کا عالم رہا پنجوں تک کی آواز نہ آئی۔ دو ڈھائی سال جیا ہو گا۔ کسی نے اسے چونچ سے چونچ ملاتے نہ دیکھا۔ مدتوں پیچھے جب مادہ نے انڈے دیئے اور وہ صبح نو بجے سے ظہر کی اذان تک انڈوں پہ بیٹھنے لگا تو پھوپی کو معلوم ہوا کہ اس نے ان کی پیش کش قبول کر لی ہے۔

ایک روز ایسا ہوا کہ وہ کھانا کھا کے قیلولے کے لئے باورچی خانے کی چھت پہ آبیٹھا۔ قضا کی مار ذرا غنودگی آگئی اور سرفراز کی بلی نے بڑی بے دردی سے پھوپی جمیلہ کی حسرتوں کا خون کر دیا۔ وہ اس نامراد بلی کا ٹیٹوا دبا دیتیں مگر کالا رنگ دیکھ کے چپکی ہو رہیں۔ خدا جانے کیا اسرار ہے خون کا سا گھونٹ پی لیا۔

مثل مشہور ہے کہ بھوتوں کے گھر اولیا اور اولیا کے گھر بھوت موہنا کا باپ جتنا شریف تھا۔ موہنا اتنا ہی شریر نکلا۔ ذرا ہاتھ پاؤں نکالے تو اچھی بری صحبت میں جا پڑا۔ دن بھر دلاور میاں کی کنگنی پہ بیٹھا محلّے کی بہو بیٹیوں کو تکا کرتا تھا۔ ہر مزار پر روپئے اپنے نین کھوئیے۔ گونج گونج کے آدھی سے زیادہ دم گھس ڈالی تھی۔ ایسا ہنکارا بھرتا کہ گلا پھول کے سپیرے کا تونبہ نظر آتا تھا۔ پھر آتیوں جاتیوں سے چونچ ملانے میں سیروں رال ٹپکا دیتا تھا۔ موہنا کی اٹھتی جوانی تھی اور ٹھوکریں کھانے کے دن۔ اس نے خوب جی بھر کے ٹھوکریں کھائیں۔

موہنا گھر سے نکلا تو بس باہر ہی کا ہو گیا۔ دراصل اسے چکوتھیوں کے مزے پڑ گئے تھے۔ وہ دلاور کی منڈیر پہ بیٹھا دھنا سیٹھی کیا کرتا تھا۔ روز نہ جانے کتنوں سے پیمان وفا باندھتا اور توڑ دیتا تھا۔ اس کے چلن پہ بڑی مردانگی برستی تھی۔ عورت خواہ انسانوں میں ہو خواہ جانوروں میں مرد کی ہوس کا نشانہ بننے پر مجبور ہے۔ اگر کوئی بے چاری مردہ مال بدنصیب مادہ اس سے پہلو تہی کرتی تو موہنا اس کے دو چار پر نوچ اپنی باچھوں میں چپکا لیتا تھا۔ یوں جیسے مرجینا پہلوان پڑوس کے بابو کی نئی نویلی دلہن کو چھیڑ کر آدھے آدھے گالوں تک پھیلی مونچھوں کو بل دیتا تھا جس نے

خوشی سے موہنا کی دعوت قبول کی وہ اس کی نظر میں چڑھ جاتی تھی۔ دیوار کھرچ کھرچ کے چونا کھلاتا تھا۔ گھنٹوں اس کے آگے ققنس بنا بیٹھا رہتا اور ذرا دیر میں ساری برادری کی چودھرائن بنا دیتا تھا۔ جو اس کے حرم میں دو چار دن رہ جاتی تھی اس کے مزاج ہی نہیں ملتے تھے۔ اٹھلاتی اٹھلاتی پھرا کرتی تھی۔ سارا جسم یوں کس جاتا جیسے ابھی پھٹ پڑے گا۔ مادہ اپنے نر کا آزادانہ انتخاب کرے تو اس کی جوانی امر بیل کی طرح پھیلتی ہے۔ راجپوتوں میں جب تک سوئمبر کی رسم موجود تھی انکی نسلیں قوی سے قوی تر ہوتی گئیں موہنا کی تند و تیز نگاہوں نے چند دنوں میں ایسا انقلاب بپا کر دیا کہ سارے بڈھے ٹھٹیرے نر باورچی خانوں کے طاقوں میں بیٹھے پرانے دمے کے مریضوں کی طرح ہوں ہوں کر کے لمبے سانس کھینچتے رہتے تھے۔

موہنا بڑا سجیلا جوان تھا۔ کشادہ پیٹھ، فراخ سینہ۔ بازو تیاری کے باعث ذرا نیچے کی طرف جھکے ہوئے اور آنکھیں ایسی روشن جیسے ریڈیم کی ڈلی خالص انگوری شراب کا قطرہ۔ کچھ ہی دن میں اس کی نسل دور دور تک پھیل گئی۔ کیسی ہی ستی ساوتری ہو۔ دو گھڑی اس کے پاس آ بیٹھے تو ٹھوکر کھائے بغیر اڑنا محال تھا صبح سے شام تک پٹاخے چھوٹتے رہتے اور پھوپی نظر اٹھا کر دیکھتیں تو موہنا چھجے سے منڈیر اور منڈیر سے چھجے کی جانب اڑتا دکھائی دیتا تھا۔ پھوپی نے جب پہلی بار موہنا کو چوما چاٹی کرتے دیکھا تو ذرا جز بز ہوئیں مگر بعد میں جب انہیں پتہ چلا کہ موہنا بڑا ہرجائی ہے وہ ہری چگ مصری کی مکھی کی طرح ایک جگہ ٹکتا ہی نہیں تو وہ مطمئن ہو گئیں۔ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جسکا ہاتھی اس کا ناؤں۔ ایک دن بھائی یوسف شکایت لے کر آئے کہ ان کے نسا وروں کی نسل بگڑ گئی ہے پھر خلیفہ بندو کے لال بند خراب ہونے کی خبر ملی اور حد تو یہ ہے کہ امراؤ بیگ کے یاہو لقانے سیدھے سادھے طاقی بچے دیئے۔ مگر ان تمام باتوں کا پھوپی جملہ پر ذرا اثر نہ ہوا۔ وہ موہنا کی شرارتوں پر ہنس کے یوں تبصرہ کرتی تھیں، میرا موہنا اس علاقے کا جاگیردار ہے۔ اس کے عیش پر بھلا کون انگلی اٹھا سکتا ہے۔ کھونٹا

اس قدر مضبوط ہو تو بچھڑا کیوں نہ کودے۔ موہنا کے اطوار دن بدن بگڑتے گئے اب وہ گھر میں ذرا دیر کو جھانکی مارتا اور تمام دن اوائی طوائی پھرا کرتا تھا۔ البتہ دانہ کھانے ذرا وقت سے بے وقت آتا تو پھوپی جمیلہ کی جبیں پہ دو چار لکیریں اُبھر آتی تھیں۔ پھر وہ نہ جانے کیا سوچنے لگتیں کہ چہرہ سُرخ ہو جاتا اور یہ لکیریں قوسِ قزح بن جاتی تھیں۔

شکایتوں کا سلسلہ دراز ہوا تو پھوپی نے ہر آنے جانے والے کو بُری طرح لتاڑنا شروع کر دیا۔ ان کا موہنا کوئی چور ڈکیت تو تھا نہیں ڈنکے کی چوٹ عیاشی کرتا تھا۔ جس کے سینے پر چار بال ہوں وہ گھر والیوں کو روک لے۔ اپنی مرغی گندی کہ پرائے چھپّر پہ انڈا دے موہنا تو، خدا رکھے، جوان تھا، خوبصورت تھا، اس کے بدن میں چار چلّو خون تھا۔ اسے کون بیڑیاں پہناتا۔

موہنا کو شہ ملی تو وہ دو کوڑی کا ہو گیا۔ بالکل نکمّا، فعلی، ہزار عیبوں کا شکار تمام دن منڈیر پہ بیٹھا طرح طرح کے گُل کھلایا کرتا اور پھوپی جمیلہ سامنے والے تخت سے اس کا نظارہ کیا کرتیں تھیں۔ بس ہاتھوں میں سروطہ لئے چھالیاں کترے جاتیں اور آنکھیں سامنے والی منڈیر پر جما دیتی تھیں۔ پہلے موہنا رات ضرور گھر میں بسر کرتا تھا۔ اِدھر سورج نے منہ چھپایا اُدھر وہ چپکے سے آن کابک میں گھس گیا مگر پھر جو آنکھوں میں ہوا بھری تو رات رات بھر غائب رہنے لگا۔ جہاں دیکھا توا پرات وہیں گزاری ساری رات۔ ٹھنڈی ٹھنڈی راتیں اکثر تاروں کی چھاؤں میں کنگنی ہی پر بیٹھ کر بسر کرتا تھا۔ کابک خالی ہوئی تو پھوپی کے دل میں وسوسے پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے لاکھ کوشش کی کہ وہ سیدھے سبھاؤ گھر آ کے بسیرا کیا کرے مگر موہنا کو تو دلاور میاں کی منڈیر کچھ ایسی بھائی تھی کہ وہ اس سے جدا ہوتے مرا جاتا تھا۔ انسان کی محبّت باؤلی ہوتی ہے۔ پھوپی کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ بھی پر لگا کر موہنا کے پاس منڈیر پہ جا بیٹھیں۔

روز شام کو عصر اور مغرب کے درمیان جب سورج کی آخری کرنیں فضا

میں ہلدی گھول دیتی تھیں تو برابر میں لگا بجلی کا تار جنگلی کبوتروں کے پنجے ٹکانے کے باعث زور زور سے ہلنے لگتا تھا۔ جو کبوتر تار پہ اپنی جگہ لے چکتے وہ بار بار پروں کو پھیلا کے توازن قائم کرتے اور کبھی کبھی بے چین پرندوں پر چونچوں سے وار بھی کر دیتے تھے دو چار شریر بچے پتھر مار مار کے انہیں اُڑاتے اور پھر دھوئیں کے متحرک بادل کا مزا لیتے تھے۔ جب یہ غول دوبارہ قیام کی سعی کرتا پروں کے طمانچے سہتا تو ایسا لگتا جیسے یہ کبوتر مکاک حلوائی کے تختے پہ سونے والے آوارہ فقیر ہیں۔ لیکن ان فقیروں کا جھگڑا تو اسی دن نمٹ گیا تھا جب مکاک نے فیصلہ کیا کہ اس کے تختہ پر آئندہ وہ سوئے گا جو اسے روز چار آنے کرایہ دے گا۔ کبوتروں میں بھی اگر مکاک جیسے چودھری ہوتے تو فساد کی جڑ منٹوں میں کٹ جاتی مگر وہاں تو بس یہ رواج تھا کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ روز دو چار کے سر پھٹتے، دو چار نیچے گر کے بلّی کے منہ پڑتے اور کچھ گھبراہٹ میں ایسی جگہ بیٹھ جاتے تھے کہ رشید کبوتر باز کا لڑکا دن چھپے آتا اور انہیں سمیٹ کر لے جاتا تھا۔

پھوپی نے یہ ماجرا دیکھا تو عصر اور مغرب کا درمیانی وقفہ جانماز پر گذارنے لگیں اور بیچ بیچ میں اپنی کٹورا سی آنکھوں سے یہ بھی دیکھتی جاتی تھیں کہ دُعا کی آواز اللہ میاں کے کانوں تک پہنچی یا نہیں۔ ذرا کسی کی چونچ موہنا کی طرف بڑھی اور پھوپی کا خون خشک ہوا۔ انہیں ایسا لگتا تھا جیسے کوئی ان کے دل میں کٹار بھونکتا ہو۔ جل تو جلال تو کا، وظیفہ پڑھ پڑھ کے آسمان کے چاروں کونوں پہ پھونکتیں اور خدائی خوار جنگلیوں کو پانی پی پی کر کوستی تھیں۔

ایک دن بڑا غضب ہوا۔ جنگلی کبوتروں کا سردار خوب چوڑا چکلا ہاڑ کباڑ لئے گاما اور غلامو پہلوان کی طرح سینہ پھلائے موہنا کی طرف بڑھنے لگا۔ موہنا لاکھ جیوٹ سہی مگر اس کی عمر ہی کیا تھی۔ بالکل بچہ ہی تو تھا اور پھر ماں باپ کے بغیر پلا تھا۔ پھوپی نے ضرور چکنا دیا تھا، زعفران اور جاوتری کھلائی تھی۔ تیز پات اور جوز مونہہ میں رکھ کے ہوا بھرائی تھی مگر ماں باپ کی بات ہی اور ہوتی

ہے۔ بچہ ان کے سامنے یوں پھلتا ہے جیسے شام کا سایہ۔ موہنا بے چارہ تو پیدا ہوتے ہی یتیم ہو گیا تھا۔ نہ ماں کے پروں کی گرمی دیکھی تھی نہ باپ کی چونچ میں چونچ ڈال کے اس کی باچھیں چیرین تھیں۔ بس یہ کہو کہ اللہ کو رکھنا تھا جو اتنا بڑا ہو گیا۔ پھوپی پیچ و تاپ کھاتی رہیں۔ ان کا بس چلتا تو اس جنگلی سردار کا سر دھڑ سے الگ کر دیتیں اور اس بے دردی سے مارتیں جیسے تاتاری فاتح اپنے دشمن کو زیر کر کے مارتے تھے مگر مجبوری کا نام صبر۔ جی مسوس کے رہ گئیں۔ موہنا نے اس مرکھنے بیل کے دو تین وار سہے پھر ذرا نیچے جھک کر پنجوں میں سر دے کے جو اوپر اٹھایا تو وہ نابکار سنبھل نہ سکا اوپر سے دو چار پر جو رسید کئے تو اس بے چارے کو کان دبا کر سامنے والے چھجے پر لدنا پڑا۔

اس رات پھوپی کو دیر تلک نیند نہیں آئی۔ اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا مگر وہ سامنے منڈیر پر کالے کالے پروں کے بیچ ایک سفید سے دھبے کو دیکھے جاتی تھیں۔ پھر یہ دھبا پھیلنے لگا اور دیکھتے دیکھتے ساری منڈیر پہ چھا گیا۔ موہنا گیندے اور گلاب کے ہار پہنے ایڑیوں میں الجھتا ریشمی تہمد باندھے بڑے سے ڈھول تاشے کے ساتھ پھوپی کی کھلی انکھڑیوں کے دروازے میں کھڑا تھا۔ پھوپی اٹھیں اور اس بانکے سجیلے جوان کی چٹ چٹ بلائیں لے لیں۔

کچھ دور کرن والی گلی میں مولوی سلیم الدین رہتے تھے۔ ان کی بیگم کو ڈاکٹر نے لمبی بیماری بتائی تھی۔ وہ باقاعدہ علاج اور دوا دارو تو کرتے نہ تھے البتہ اپنی چٹ پٹ ضرور کئے جاتے تھے۔ کسی نے ان سے کہہ دیا کہ کبوتر پال لیجئے۔ ان کے پروں کی ہوا پرانے بخار کا علاج ہے۔ چنانچہ وہ چوک سے جا کر چند بد قوے کبوتر خرید لائے ان ہی میں ایک گنجی کھر بجی نقطی کبوتری بھی تھی۔ مولوی صاحب کے ان گنت بچوں نے دن میں کئی کئی مرتبہ روٹی کے ٹکڑے کھلائے اور طرح وضع کا اناج دیا تو وہ پھول کے کپا ہو گئی۔ مثل مشہور ہے کہ جوانی میں تو سبھی پہ روپ آتا ہے پھر یہ نیچی قوم کی جوانی۔ اس کا جسم خوب گدرا گیا اور ایسی چربائی کہ دیکھنے والے کی نظر پھسلتی تھی۔ موٹاپے سے

رانیں ذرا چھدرا گئی تھیں ۔ وہ چلنے میں یوں لہریں لیتی جیسے پوتر گنگا پر پیچ پہاڑیوں سے گذرتی ہو۔ ننگی ننگی لٹا نگوں میں پینجنیاں پہنے چوکوں کے فرش پر چلتی تو ایسا لگتا جیسے اندر کے اکھاڑے کی اپسرا مینکا تاتا کار ناچتی ہو اور گھڑی بھر میں قیامت آجائے گی ۔ اونچی اُڑان اُڑنے کے دم خم تو اس نسل کے کبوتروں میں سرے سے ہوتے ہی نہیں وہ کھانے پینے سے فارغ ہوتی تو دو گھڑی موہنا کے پاس منڈیر پر آبیٹھتی تھی ۔

موہنا کی ناک میں کنوارے کنوارے جسم کی بھینی بھینی خوشبو پہنچی تو اس کا رُواں رُواں جُھوم گیا ۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تو نہ تھا مگر خدا جانے اس نفطی میں کیا بات تھی کہ موہنا کے ہوش پہ بجلی سی گر پڑی ۔ کئی دن تک تو بازوؤں میں چونچ دیے وہ کنکھیوں سے اس حرافہ کو دیکھا کیا ۔ پھر ایک روز ہمت کر کے آگ کے دریا میں چھلانگ لگا دی ۔ نفطی سٹلّو نے موہنا کے سارے رُوپ دیکھے تھے وہ اس کے دل میں لگی آگ کو بھڑکانے کے لئے نت نئے غمزے دکھاتی تھی ۔ دھوپ میں لیٹ کر اپنے پروں کو پھیلاتی تو موہنا کی موتی کٹی آنکھوں میں سرسوں پھولنے لگتی تھی پھر چونچ سے کرید کرید کر ان پروں کو یوں سنوارتی تھی جیسے چت چور ترکش میں تیروں کو سجاتی ہو کبھی تتلی بن کر ہوا میں تیز تیز اُڑنے لگتی اور کبھی کھلے آسمان کے نیچے کستوری ہرن کی مانند اپنے نافے کی خوشبو لیتی تھی ۔ موہنا یوسف تو تھا نہیں کہ زُلیخا کی شوخیوں کو چپکے سے پی جاتا ۔ کھیلا کو دا مرد تھا ۔ داؤں گھات سے بخوبی واقف ۔ پہلے دھیرے دھیرے سر تال ملائے پھر دلوانہ وار سنگت دینے لگا ۔ عورت عیاری پہ اُتر آئے تو مرد کی ایک نہیں چلنے دیتی موہنا حرف مطلب زبان پر لاتا تو وہ صاف جُل دے کے نکل جاتی تھی ۔ یوں بھوپی نے کئی بار اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ گھنٹوں موہنا کے سر میں چونچ سے کنگھی کیا کرتی تھی ۔ وہ زمین پر لوٹا ٹکاتا تو جسم کو تول اس کی کمر پہ سقراط کی بیوی کی طرح سوار ہو جاتی تھی مگر موہنا اس کے اچھوتے بدن کو گدگداتا یا شوخی سے چٹکی لیتا تھا تو پروں کو سمیٹ کر ایسی چوکنّی ہوتی تھی جیسے اصیل گھوڑا سایہ سے بھڑکتا ہے ۔

پھوپی جمیلہ نے موہنا کی یہ خواری دیکھی تو آپے سے باہر ہو گئیں اور اس شفتل کو ہزاروں صلواتیں سُنا ڈالیں۔ نہ ذات نہ زمات۔ موئی دو ٹکے کی چھوکری، ایسی مستانی ہوئی کہ اپنی اوقات ہی بھول گئی۔ مخمل میں مخمل کا پیوند سمجھا ہے۔ کہاں موہنا اونچی ذات کا کابلی قلا باز اور کہاں یہ دوغلی بے ذات نفطی، گندی بوٹی کا گن اِشورہ۔ مگر جب موہنا کے آگے ان کی ایک نہ چلی تو اپنے دل کو یوں سمجھا لیا کہ چلو کیا حرج ہے۔ موہنا کوئی افلاطونی عاشق تو ہے نہیں کہ ایک گھر کا ہو رہے گا۔ وہ تو پارے کی طرح بے قرار جندری ہے۔ دو چار دن اس مال زادی کے ساتھ گذار دے گا تو کونسی اس کی ذات گھٹ جائیگی ہیرا کیچڑ میں گر جائے تو بھی ہیرا ہی رہتا ہے۔ پھر کچھ دن اسی طرح گذر گئے۔ اور انہوں نے دیکھا کہ موہنا فقط پیچ و تاب کھاتا ہے اور رسائی نہیں ہوتی تو انہیں تشویش ہوئی۔ موہنا نرالا تھا اسے نیاز مندی سے کیا کام بڑا جھنجھلایا کرتا، دست درازیاں کرتا مگر تریا ہٹ کے آگے بے چارے کی ایک نہ چلتی تھی عورت یوں اپنا آپ کسی کے حوالے کر دے تو خیر ورنہ اچھے اچھوں پہ وار آتی ہے۔

سچ پوچھئے تو دل نفطی کا بھی آگیا تھا مگر وہ چاہتی تھی کہ موہنا عشق کے آتش دان میں خوب تپیا کر کے پہلے کندن کا بن جائے اور پھر وہ اس کندن کی ڈلی کو ہمیشہ کے لئے اپنے دل کی کابک میں رکھ لے۔ محبت جب عقل کے سہارے چلے تو عیاری ہو جاتی ہے۔ پھوپی جمیلہ اس کی نیت بھانپ گئیں اُنہوں نے بھی ایک زمانہ دیکھا تھا۔ کوئی دھوپ میں بال سفید تھوڑی کئے تھے۔ ایک دن موہنا صحن میں کھانا کھانے اُترا تو انہوں نے اسے باورچی خانے میں گھیر کے دروازہ بند کر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ پہلے تو بے ساختہ چومتی رہیں پھر تلے دانی سے قینچی نکال سات سات کلیاں تراش ڈالیں۔ موہنا کو خاک پتہ نہ چلا کہ اس کے پیروں میں چارہ گر نے بیڑیاں پہنا دی ہیں۔ وہ ہاتھ سے چھٹا تو وہ بڑی بے چینی سے پروں کو کریانے لگا۔ اور کیاری کے پاس جا لوں

بیٹھ گیا جیسے وہ اصل میں آج یتیم ہوا ہو۔

دو ایک روز کبوتری نے انتظار کیا جب موہنا منڈیر پر نہ آیا تو وہ خود ایک دن اس کے پاس جا پہنچی۔ گرمیوں کی تپتی دوپہر تھی پھوپی اندر والا کمرہ بند کیئے آرام سے پڑی تھیں۔ دونوں عاشق و معشوق بڑی دیر تک ایکدوسرے کو تکا کیئے۔ پر سے پر ملائے بیٹھے رہے۔ پھر گھڑونچی کے نیچے جا مٹکے کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے خوب نہائے۔ کچھ دیر بعد جب سورج کے موہنہ پر جھائیاں پڑنے لگیں تو پھوپی چندھیائی ہوئی آنکھوں اور سیٹھے سیٹھے موہنہ کے ساتھ پان کی کترن کھائے الکساتی باہر نکلیں چھوٹتے ہی نظر موہنا کے پہلو میں بیٹھی اس قطامہ پر پڑی۔ سروتا کھینچ کے جو مارا تو وہ چکرا کر زمین پر لوٹنے لگی۔ ایک بازو شل ہو گیا تھا۔ اُفتاں و خیزاں دیوار پکڑی اور موہنا کو الوداع کہہ کر گرتی پڑتی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی انسان ہو یا حیوان جان سب کو پیاری ہوتی ہے اس دن کے بعد سے اس نے دور سے موہنا کو ایک آدھ بار ضرور دیکھا مگر پاس آنے کی ہمّت کبھی نہ کی۔ محبّت اور دُوری آگ اور ہوا کی مانند ہلکی ہو تو بجھ جاتی ہے تیز ہو تو بھڑک اٹھتی ہے۔ موہنا خواہ کتنا ہی دیوانہ تھا مگر وہ تو اسے بس دل بہلانے کا کھلونا ہی سمجھتی تھی اور یوں بھی عورت کی محبّت اعتدال سے آگے کم بڑھتی ہے۔ ناخدا کوئی ہو اسے تو ساحل پر اُترنے کی تمنّا ہوتی ہے جب رگوں میں بجلیاں کوندیں اور بادبان کھول دیئے گئے تو یہ کشتی کسی اجنبی زمین کے انجانے کنارے سے جا لگی۔

برباد تو بے چارہ موہنا ہوا جس کی بھرپور جوانی ذراسی شوخی میں غارت ہو گئی۔ وہ اپنی سب شرارتیں بھول گیا۔ تمام دن تھوا سا بیٹھا رہتا تھا۔ اَب تو یہ حال ہو گیا تھا کہ نچی جو پچ والے آن آن کے اسے چڑیا جاتے تھے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینے میں بتاشے کی طرح بیٹھ گیا کلیاں نکلتیں تو نوچ نوچ کے سارا بدن لہو لہان کر لیتا تھا۔ اس کی دم کے نیچے بڑا سا کانٹا نکل آیا تھا۔ پھوپی نے ایک دن ہاتھ میں اُٹھایا تو بالشت بھر کی سیپ دیکھ کے ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ ہلکا

پھول ہو گیا تھا۔ پھوپی نے مومیائی کھلائی مگر موہنا صبح کے چراغ کی طرح آہستہ آہستہ بجھتا ہی رہا۔

ایک دن بڑے زور کی بارش آئی۔ پھر چھوٹے چھوٹے اُولے پڑنے لگے پھوپی نے موہنا کو کابک میں ڈالا اور خود کسی کام میں جٹ گئیں موہنا جان سے عاجز تو تھا ہی کابک سے نکل کھلی انگنائی میں ٹہلنے لگا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا کمزور جسم سردی کی شدّت سے کانپ کانپ گیا۔ مگر موہنا نے دیوار، چھجّے یا کسی پیڑ کی اوٹ نہ لی۔ شام کو پھوپی نے اس کا جسم تولیے سے خشک کیا۔ پھر انگیٹھی کے قریب دیر تک لئے بیٹھی رہیں اور رات کو ایک لونگ کا پھول کھلا کے پانچ سیر روئی کے لحاف میں اپنے ساتھ لِٹا لیا۔

صبح وہ موہنا کی بے وفائی کا ماتم کرتی بستر سے اُٹھیں تو اپنے میاں سے دس سال بڑی دِکھائی دیتی تھیں۔

پھوپی جمیلہ کے میاں ستر کے پیٹے میں تھے اور وہ خود پچاس یا پچپن برس کی ہونگی۔

میں نے ایک عورت دیکھی

میں نے ایک عورت دیکھی ، سوکھی ، سہمی ، چمرخ سی ، اس کے گالوں کی ہڈیاں خوب ابھری ہوئی تھیں اوران پر انڈے کی زردی سی ملی رہتی تھی ۔ گلا خشک اور گردن پتلی تھی جسمیں نبض کی حرکت کا ارتعاش صاف دکھائی دیتا تھا ۔ قدلانبا تھا خاصا نکلتا ہوا ۔ سینہ ایسا جیسا بس ایک جسیم مرد کا ہوتا ہے ۔ ننگا کھلا تو میں نے دیکھا نہیں ہاں اندازے سے کہہ سکتا ہوں کہ چھاتیوں کی ہلکی ہلکی قوسیں ہوں گی اور بھٹنی اتنی جتنا کابلی چنا ۔ اس کے بال بڑے گھنے تھے اور چوٹی بھی خوب لمبی تھی ، پنڈلیوں کی مچھلیوں کو چھوتی ہوئی ۔ ٹانگیں پتلی پتلی سرانچے کے بانس پنڈلی کی ہڈیوں پر ایک ایک پسند الپٹا ہوا ۔ کولھوں پر البتہ سیر سوا سیر گوشت ہوگا ۔ چپاتی سا پیٹ تھا اور کمر معدوم سمجھیے رنگ سیاہ روکھا روکھا جیسا کہ دھوپ میں سکھائے ہوئے بالوں کا ہوتا ہے ہاتھ لمبی لمبی کمانیوں کی طرح جھول جھول کے ہلتے رہتے تھے اور جب وہ بات کرتی تو گفتگو میں ایسا ساتھ دیتے تھے جیسے زبان کی اردلی میں ہوں ۔ وہ چلنے میں ایڑیوں کو زور زور سے ٹختی تھی ۔ اس طرح سے جیسے اپنے ہلکے پھلکے وجود کا زمین کے وسیع وعریض پھیلاؤ کو احساس دلاتی ہو ۔ ٹانگیں جھٹکے کھانے لگتی تھیں اور سارا بدن لرز لرز کے ساکت ہو جاتا تھا ۔ اس کے کھوے ذرا جھکے ہوئے تھے شاید ہوا کے دباؤ کا بوجھ ان پر گراں گذرتا تھا وہ تو کہیے کہ ہنسلی کی ہڈیوں نے روک رکھا تھا ورنہ خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچتے ۔ ناک پتلی تھی ستواں اور نکیلی مگر خوب صورت خاک نہ لگتی تھی ۔ ہاں آنکھیں پرکشش تھیں بڑی بڑی غلافی ، چمکدار ، سیاہ اور ان کے گرد کی سفیدی جھیل کی طرح شفاف تھی جن میں پتلیاں ادھر ادھر ڈولتیں تو یوں محسوس ہوتا جیسے سارے جسم کی جان کھنچ کر آنکھوں میں آگئی ہو ۔ کچھ کچھ شریر بھی تھیں ۔ انھیں دیکھیے تو نہ جانے کیوں ان سے آنکھیں چرانے کو جی چاہتا تھا یہ آنکھیں

اس کے جسم پر قطعی بے جوڑ تھیں۔ قدرت کا ایک حسین مذاق۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ اس کی نہ ہوں۔ کسی سے مستعار لی ہوں۔ مجھے وہ جب بھی ملی۔ میں اس کی آنکھوں کو دیکھتا تھا۔ لمبی لمبی جنگل پلکوں میں غلافی پپوٹوں تلے یہ آنکھیں ہر وقت رم کرتی رہتی تھیں۔ البتہ ان آنکھوں کے علاوہ وہ مجھے کسی کونے سے پسند نہ تھی۔ پسند کیا خاک ہوتی۔ اس میں رکھا ہی کیا تھا۔ بوسہ لیجئے تو ایسا لگے جیسے مداری کے منہ میں گولا آن پھنسا ہو۔ اور بستر کی خلوت نصیب ہو تو ہڈیوں کے پنجر سے الجھتے رہیئے۔

صرف بات چیت کرنی ہو تو مجھے عورت سے زیادہ مرد پسند ہیں۔ یا پھر عورت ہو تو دہکتی اور سلگتی ہوئی۔ مرد کو ایک حیاتی کیف کے سمندر میں ڈبو دے۔ میں مسلمان ہوں۔ عورت کو قصائی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اس کا جسم بھرا بھرا ہونا چاہیئے۔ خوب گدرا اور گداز جسے چھوئیے تو آپ کا رواں رواں جھوم اُٹھے اور چھیڑیئے تو تازہ کٹے ہوئے بکرے کے گوشت کی طرح دیر تک پھڑکتا رہے۔ میں گوشت کھاتا ہوں اور گوشت کے لمس کو دنیا کی سب سے بڑی لذّت سمجھتا ہوں۔ مگر یہ میری کہانی تھوڑی ہے۔ میں پتہ نہیں کہاں سے آگیا۔ یہ تو بلقیس کی کہانی ہے بلقیس اس سوکھی، سہمی چمرخ سی عورت کا نام ہے۔ یا پھر یہ اسلم کی کہانی ہوسکتی ہے۔ میں تو خواہ مخواہ بیچ میں کود پڑا۔

اسلم میرا دوست ہے۔ بڑا سمجھدار اور پڑھا لکھا انسان۔ پڑھا تو میں نے بھی ہے مگر صرف پیشے کے لئے۔ میری ڈگری میری جاگیر ہے۔ میں اس کا کرایہ کھاتا ہوں۔ ایک بار محنت کر کے درخت لگایا اب اس کے سائے میں آرام سے سوتا ہوں۔ کبھی اُٹھا تو اِدھر اُدھر دیکھ لیا۔ دو چار جماہیاں لیں اور پھر سو گیا۔ اللہ کا شکر ہے مجھے نیند خوب آتی ہے۔ نیند نہ آئے تو میں بھی اسلم کی طرح پاگل ہو جاؤں۔ وہ بے چارہ جاگ جاگ کے پاگل ہو گیا ہے۔ خوب پڑھتا ہے۔ میں نے ہزار بار سمجھایا کہ ہم ہندوستانیوں میں اتنا ظرف نہیں ہوتا کہ زیادہ علم کو پچا سکیں۔ بس اتنا پڑھئے جتنا روٹی اور روزی کے لئے ضروری ہے ورنہ بدہضمی ہو جائے گی۔ وہ میری باتوں پہ ہنستا ہے۔ بے چارے کا دماغ چل گیا ہے صحیح بات اس کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ آئے کیسے وہ رات دن تو جاگتا ہے۔

میں صبح کی سیر کو نکلتا ہوں تو وہ مجھے راستہ میں کہیں نہ کہیں مل جاتا ہے۔ اس کا چہرہ اس وقت بھی اُداس ہوتا ہے۔ تھکا تھکا پژمردہ سا۔ بال پریشان ہوتے ہیں۔ شیو بڑھا ہوا اور کپڑے ایسے جیسے شام کا سایہ۔ اسکے منہ میں اس وقت بھی سگریٹ ہوتا ہے چار مینار، وہ دھوئیں میں سانس لینے کا عادی ہو گیا ہے۔ تازہ ہوا میں سانس لیتے ہی اسے زکام ہو جاتا ہے۔ وہ رات کو دو ڈھائی بجے تک پڑھتا ہے۔ خدا جانے کیا کیا۔ پھر اس علم کو تحلیل کرنے کے لئے ویران اور سنسان سڑکوں پر نکل جاتا ہے۔ اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ شادی ہو جاتی تو وہ بھی اپنی بیوی کے پہلو میں آرام سے سوتا اور علی الصبح رات بھر میں آنے والی کمزوری کی تلافی کرنے سیر کو بھی ضرور جاتا۔ تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لیتا اور کچی کھانڈ کے چھوٹے چھوٹے بتاشوں پر بڑھ کا دُودھ رکھ کر چاٹتا کہ اگلی رات کی عیش کوشی کے لئے پھر سے تیار ہو جائے کتنا لُطف آتا اسے زندگی کا۔ پھول پھول کے ارنا بھینسا ہو جاتا اور خوراک اِتنی بڑھ جاتی کہ پھر اس کی زندگی کا محور و مرکز پیٹ ہوتا۔

مجھے ایسے لوگ بہت پسند ہیں جو زیادہ کھاتے اور ورزش کرتے ہیں۔ پیٹ کے گرد گھومتی ہوئی زندگی لا اُبالی سی ہوتی ہے۔ تازہ و توانا خوش و خرم۔ اپنے آپ میں مگن اور بالکل فطری، قدرت کی خواہش کے عین مطابق۔ قدرت نے پیٹ کو سارے جسم کا مرکز بنایا ہے۔ ناف پر پرکار کی نوک رکھئے اور گھمائیے تو سر سے لے کر پیر تک سارا جسم ایک دائرے میں سمٹ آئے گا۔ دماغ تو الگ تھلگ ایک چھوٹا سا حصّہ ہے اسے جتنی اہمیت دیجئے اتنا ہی گھمنڈی ہو جاتا ہے۔ سچ پُوچھئے تو دنیا کی ساری مصیبتیں اسی چھوٹے سے حصّہ کی پیدا کردہ ہیں۔ میں جب آئینے میں بغور خود کو دیکھتا ہوں تو دماغ آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس لئے میں نے اسے نظر انداز کر دیا ہے۔ جب ضرورت ہوئی تو خدمت لی ورنہ تو کون میں کون۔ بیٹھے رہیے ایک کونے میں۔ تم میرے غلام ہو یا میں تمہارا غلام ہوں اسلم میری باتوں کا مذاق اُڑاتا ہے۔ اس کا فلسفہ کچھ اور ہے۔ وہ کہتا ہے پیٹ حکومت کو بھرنا چاہئے خوب! کس کی بکری کون ڈالے گھانس۔ میرا اس کا ہمیشہ نظریاتی اِختلاف رہا۔ مگر پھر بھی ہم دونوں دوست ہیں۔ میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی تسلی ہوتی ہے ایک فخر سا محسوس ہوتا ہے۔ اپنی کامیابی کا احساس مجھے اسلم کی ناکامی سے ہوتا ہے وہ

نہ ہو تو میں اپنی نظر میں گر جاؤں ۔ اسی لئے تو میں اس سے دوستی چھوڑنا نہیں چاہتا نبھائے جاتا ہوں ۔

اسلم میرے ساتھ بی ۔ اے ۔ میں پڑھتا تھا ۔ وہ بڑا ذہین طالب علم تھا ۔ کبھی کبھی استادوں سے سوال کرتا تو اُستاد چکرا جاتے تھے ۔ اس کا مطالعہ اِس زمانہ میں بھی وسیع تھا ۔ وہ کہتا تھا اُنیسویں اور بیسویں صدی مادی ترقیوں کی معراج ہے انسان کا ذہن بہت پیچھے رہ گیا ۔ جب تک انسان ذہنی طور پر ایک جست لگا کر موجودہ دور کے ہم رکاب نہیں آئے گا وہ مطمئن نہیں ہو سکتا ۔ الجھنوں میں مبتلا رہیگا ۔ لہذا وہ خود بھی الجھنوں میں مبتلا تھا ۔ اس نے فلسفہ میں ایم ۔ اے کیا تھا ——— اور میرا خیال ہے فلسفہ نے اس کے دماغ کا کوئی پرزہ بگاڑ دیا تھا ۔ وہ کہتا تھا انسان نے اپنی تساہل پسندی سے خود کو ایک معمّہ بنا لیا ہے حقیقت کا کھوج لگانے کے بجائے مذہب اور روایتی فلسفہ کا سہارا لے کر اس نے اپنے گرد اوہام کا ایک جال بن لیا ہے اب وہ اس جال میں مقید ہے لیکن اسے باہر نکلنا چاہئے ——— زندگی کی ماہیت کو ذاتی تجربے سے سمجھنا چاہئے ۔ اور یہ کام تب ہی ہو سکتا ہے ۔ جب وہ اخلاق، مذہب اور ایسے دوسرے وہموں کو ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دے ۔ اسلم زندگی کے ہر ضابطہ سے منحرف تھا ۔ وہ کہتا تھا دیوار کج ہو جائے تو اسکی بنیادیں گرا کے اسے دوبارہ بنانا چاہیئے ۔ اس کے دماغ میں "میں" سمائی تھی اور اپنے علاوہ ہر انسان کے تجربے کو وہ شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا ۔

پڑھ لکھ کر فارغ ہوا تو اسلم آئی ۔ اے ۔ ایس کے اِمتحان میں بیٹھا اور پاس بھی ہو گیا ۔ میں نے کہا کسی کی سفارش کرا کے انٹرویو میں اور نکل جاؤ ۔ بس پھر عیش ہی عیش ہے مگر اس نے سُنی اَن سُنی کر دی ۔ انٹرویو میں گیا تو اناپ شناپ خدا جانے کیا بک آیا آخر آج تک پچھتاتا ہے ۔ اس پچھتاوے کا اس نے کبھی ذکر تو نہیں کیا مگر میرا قیاس ہے آدمی کچھ کھودے تو ساری زندگی کڑھتا رہتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ اسلم تو کچھ بے حس ہو گیا ہے ۔ نہ جانے کیوں، شاید اپنی محرومیوں کی وجہ سے یا پھر جنسی ناآسودگی کے باعث زندگی

کی برکتوں سے اس کا ایمان اُٹھ گیا ہے۔ میں نے بار بار مشورہ دیا کہ اسلم تم شادی کرلو۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے مگر وہ شادی کرے تو کیسے کرے۔ اسے عورت کی ذہنی محکومی سے نفرت ہے۔ وہ بڑی آزاد خیال عورت چاہتا ہے اور ایسی عورت کسی بڑے افسر، میجر، یا منسٹر کی بیٹی ہو سکتی ہے۔ عام آدمی کی نہیں۔ دبی دبائی سیدھی سادی، گھریلو لڑکیاں اسے پسند نہیں ورنہ میں اپنی جاننے والیوں میں کہیں نہ کہیں بات چلا کر کسی نہ کسی طرح یہ کام کرا ہی دیتا۔

ہماری کلاس میں ایک لڑکی تھی۔ شاہدہ۔ دھیرے دھیرے چلنے والی اور آہستہ آہستہ بولنے والی۔ اس کا باپ بڑا مالدار آدمی تھا مگر اس لڑکی میں تمکنت نام کو نہ تھی۔ وہ بڑی خلیق اور ملنسار تھی۔ بات کرتی تھی تو دل کو ایسا لگتا تھا جیسے پھول کی پتی پہ ہلکے ہلکے شبنم کی آبشار گرتی ہو۔ اس کا رنگ شہابی تھا اور آنکھیں مرغزاروں کی کی طرح میٹھی نیند سُلانے والی جسم متناسب، صحت مند اور قوسِ قزح کی طرح رنگین تھا وہ اسلم سے نہ جانے کیوں متاثر ہو گئی۔ شاید اس لئے کہ اسلم کلاس کا واحد لڑکا تھا جو اس سے بے نیاز رہتا تھا۔ میں نے کئی بار اسلم کے لئے شاہدہ کے پیغامات وصول کئے اور بیچ میں ہی ہڑپ کر گیا۔ بات یہ ہے کہ مجھے شاہدہ خود بہت پسند تھی اس کی خوابناک شخصیت کسی بھی دوست کو دُشمنی پر مجبور کرنے کے لئے کافی تھی۔ پھر میں تو ازل کا حُسن پرست واقع ہوا ہوں۔ بھنورے کی طرح ہر پھول کے گرد منڈلانے والا۔ مجھے حُسن سے والہانہ لگاؤ ہے۔ جب کسی خوبصورت لڑکی کو اپنے علاوہ کسی دوسرے کی طرف مائل دیکھتا ہوں تو کم از کم بیچ میں ضرور کود پڑتا ہوں۔ یہ میری عادت ہے اور اس عادت کو میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ عورت کو دیکھ کر محظوظ ہونا مرد کا پیدائشی حق ہے اس لئے میں شاہدہ کو دیکھ کر مدتوں محظوظ ہوتا رہا۔ مگر وہ کم بخت اسلم پر مائل تھی۔ شاید اسی وجہ سے عورت کو ناقص العقل کہا گیا ہے کہ عاشقی کا جواب بے نیازی سے دیتی ہے اور بے نیازی کا عاشقی سے۔

مجھے شاہدہ کی قسمت پر رحم آتا تھا اور اسلم کی قسمت پر رشک اور یہ رشک رفتہ

رفتہ رقابت میں بدل گیا۔ اسلم جذباتی اعتبار سے بالکل سرد تھا۔ ایک زندہ لاش۔ اسے عورت کی محبت پہ اعتماد ہی نہ تھا۔ وہ کہتا تھا محبت تو آزاد روح کا نغمہ ہے۔ تم جس عورت سے محبت طلب کرتے ہو وہ محبت کر ہی نہیں سکتی۔ اس کا ذہن صدیوں کی غلامی سے بیمار ہے۔ وہ مرد کو عادتاً تو چاہ سکتی ہے لیکن اس چاہ میں اس کے شعور کو دخل نہیں ہر بیوی اپنے شوہر کو چاہتی ہے اس لئے کہ وہ کسی اور کو نہیں چاہ سکتی۔ ہر عورت زندگی میں کسی نہ کسی مرد سے محبت کرتی ہے کیونکہ اسے زندگی کی تکمیل کے لئے ایک مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اب چند عورتوں نے محبت کو اسپورٹس بنا لیا ہے مگر یہ بھی کوئی صحت مند جذبہ نہیں ہے۔ برسوں کی پامالی کا ردِ عمل ہے۔ انتقامی ہوسناکی ہے۔ عورت کو مدتوں مرد نے اس کی مرضی کے خلاف اپنے تصرف میں رکھا ہے۔ یہ ایک قسم کی ایذا پسندی ہے جس نے عورت کو بھی جنسی کجروی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب ایک دائمی ناآسودگی مرد اور عورت کا مقدر ہو گئی ہے۔ لوگ جسے محبت کہتے ہیں وہ اسی دائمی ناآسودگی اور خلفشار کا نام ہے۔

میں نے ایک آدھ بار اسلم سے شاہدہ کا ذکر بھی کیا تو اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ وہ شاہدہ کے باپ کی دولت سے ناراض تھا۔ اسے دولت مندوں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید اسی دولت کے زعم میں شاہدہ اس کا شکار کھیل رہی ہے اسی لئے وہ شاہدہ سے نفرت کرنے لگا اور میں محبت۔ دولت مند عورت سے شادی کرنا مرد کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ بڑھاپے تک عیاشی کے مواقع ملتے ہیں۔ پھر یہ کہ غریبی میں حسن کمھلا جاتا ہے اور دولت کی آنچ سے حُسن کی شراب میں تندی اور تیزی آجاتی ہے۔ شاہدہ پر میں نے آہستہ آہستہ ڈورے ڈالنے شروع کئے اور وہ ایک دن سیدھی راہ پر آن لگی۔ میں سمجھتا ہوں عورت کی قوتِ فیصلہ کمزور ہوتی ہے۔ مرد مستقل مزاجی سے اس کا پیچھا کرے تو وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ شاہدہ نے اسلم کو چھوڑ مجھے پکڑ لیا۔ آج وہ میری بیوی ہے۔ مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ ہماری شادی کو تین برس ہو گئے اور وہ میرے تین بچوں کی ماں

ہے۔ لیجئے میں پھر بیچ میں آن کودا۔ معاف کیجئے گا یہ میری کہانی نہیں شاہدہ اور اسلم کی کہانی ہے مگر نہیں شاہدہ تو اب میری بیوی ہے اور اسلم کے نام سے چڑتی ہے۔ یہ تو بلقیس اور اسلم کی کہانی ہے۔ بلقیس اور اسلم کی کہانی۔

بلقیس کو میں نے پہلی مرتبہ اسلم کے ساتھ دیکھا تھا۔ مجھے یہ عورت بالکل پسند نہیں آئی۔ ایک نظر میں نفرت سی ہو گئی۔ وہ عورت نہیں بلا معلوم ہوتی تھی۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو مجھ میں تحریک پیدا کرتا اور وہ عورت جو مرد میں تحریک پیدا نہ کر سکے میری نظر میں عورت ہی نہیں۔ بات چیت ہوئی تو پتہ چلا کہ بلقیس بھی ارسطو کی پوتی ہے۔ اونٹ کی کمر اونٹ ہی کھجاتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اسلم اور بلقیس کی قربت ہم خیالی کا نتیجہ ہے۔ وہ کہتی تھی کہ ہندوستان میں عورت کبھی آزاد ہو ہی نہیں سکتی۔ میں نے کہا زندگی کے ہر شعبہ میں عورت کا دخل، آزادی نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ ہنسنے لگی جیسے میں نے کوئی مہمل بات کہی ہو۔ پھر میں خاموش ہو گیا تو اس نے مجھ سے معافی مانگی اور کہا بُرا نہ مانئے آپ مرد ہیں۔ آپ پر مرد کی فسطائی ذہنیت کا اثر ہے۔ یہ اثر آپ کو ورثے میں ملا ہے اس لئے آپ بے قصور ہیں مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ میں عورت کو مرد کی طرح آزاد دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہی میرا مشن ہے۔ میں زندگی کے ہر شعبہ میں عورت کی نمائندگی سے مطمئن نہیں ہوں۔ یہ ایک ڈھونگ ہے سیاسی ڈرامہ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ عورت نے معاشی طور پر بھی خود کو آزاد کرا لیا ہے۔ مگر یہ کافی نہیں ہے۔ وہ کماتی ہے اور مرد کھاتا ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ اس کے لقمے کھا کے اس پر حکومت بھی کرتا ہے اسے عورت کی محرومی نہیں تو اور کیا کہنا چاہیئے۔ میں عورت کی محکومیت کو ختم ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کی انا جاگ اُٹھے۔ وہ مرد کے سہارے بغیر جینے کا حوصلہ پیدا کرے۔ اسے جنس کے ایک فطری جذبے کی تسکین کے لئے مرد کے پیر دھو دھو کر پینے سے نجات ملے۔ وہ معاشرہ کی ایک فرد ہو، آزاد، خود مختار محض ایک ضمیمہ نہیں۔ کتنی عورتیں گھریلو زندگی میں آزاد ہیں کتنی عورتیں شادی ہونے کے بعد اپنے جمالیاتی ذوق کو زندہ رکھتی ہیں۔ عورت کو ہمارے

سماج نے بہن، بیٹی، ماں، بیوی اور کسبی بنایا ہے۔ عورت نہیں رہنے دیا۔ مرد ہمیشہ مرد رہتا ہے۔ نوّے سال کا مرد چودہ برس کی اُٹھتی جوانی پر للچائی ہوئی نظر ڈالتا ہے اور اس سے بستر کی خلوت کا خواہشمند ہوتا ہے۔ عورت بیوی ہوتے ہی مر جاتی ہے وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی مرد کے لئے ایک توصیفی کلمہ کہنا گناہ سمجھتی ہے۔ اس کی زندگی میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ موت کا سا ٹھہراؤ۔ بچے جنتی ہے اور محکوم مظلوم افراد کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے۔ صحت منداولاد پیدا کرنے کے لئے صحت مند ذہن ہونا بڑا ضروری ہے۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں۔ آپ میرے پاس بیٹھے ہیں سچ بتایئے کیا آپ نے میرا بھرپور جائزہ نہیں لیا۔ کیا آپ نے مجھے ہر زاوئے سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ مجھ میں جنسی کشش تلاش کر پائے یا نہیں یہ ایک الگ سوال ہے لیکن اگر میں آپ کو متاثر کروں تو کیا آپ اپنی بیوی کو یاد رکھیں گے۔ آپ خود کو شوہر سمجھیں گے یا مرد آپ میرے جسم کو چھونے اور اس سے کھیلنے کی خواہش کریں گے یا نہیں۔ عورت ایسا کیوں نہیں کرتی۔ اس کے جنسی تقاضے اور اس کا ذوق جمال کہاں مرجاتا ہے۔ سولہویں برس اس کے ہاتھ پیلے ہوئے اور باقی عمر بس وہ ایک بیوی ہو کر جیئے۔ عورت نہیں۔ عورت غائب ہوئی۔ یہ کیا مذاق ہے۔ جوانی میں مرد اپنی جنسی بے راہ روی پر ناز کرتا ہے لیکن اگر عورت اس راستہ پر جائے تو قحبہ کہلاتی ہے۔ میں جنسی ابتذال کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی لیکن اگر مرد اپنی ہوسناکی سے باز نہیں آتا تو پھر عورت کو بھی اس کے خلاف انتقامی کارروائی کرنی چاہیئے۔ اخلاق کے دو پیمانے نہیں ہو سکتے مرد عورت دونوں کے اعمال کو ایک ہی ترازو میں تولنا چاہیئے میں بلقیس کی یہ تقریر سن کر سکتے میں آگیا اور وہ خاموش ہو گئی۔

بلقیس مجھے ایک دن پھر کافی ہاؤس میں ملی۔ اس روز اس کے ساتھ کوئی اور مرد تھا۔ مجھے بلقیس پر بڑا غصہ آیا۔ فاحشہ کہیں کی۔ بیک وقت کئی مردوں کو لبھاتی ہے۔ اس نے مجھے سلام کیا تو میں ذرا دیر کے لئے اس کی ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ مرد نے عورت کو اپنا زر خرید غلام سمجھ لیا ہے۔ عورت آج بھی بکتی ہے ——

عورت کا ذہن مفلوج ہو گیا ہے۔ مرد کے تشدد نے اس کی فکری قوتوں کو سلب کر لیا ہے۔ مرد اور عورت کا ملاپ باہمی پسند پر مبنی ہونا چاہیئے۔ اس میں زبردستی کی جائے تو لذّت کافور ہو جاتی ہے اور آدمی کی رُوح بوجھل۔ جیسے آج کے انسان کی ہے۔ وہ دیر تک بولتی رہی جنس کی لذت زندگی کی مسرتوں کا سرچشمہ ہے لیکن یہ لذت فطری ہونی چاہیئے اکتسابی نہیں۔ عورت کی انفرادیت مرد کے غاصبانہ وجود سے ختم ہوئی مرد نے جب چاہا لذت کا اکتساب کیا۔ لیکن یہ لذّت نہیں لذّت کا فریب ہے اس لئے اس میں خوشی نہیں، مسرت نہیں تشنگی ہے، ناآسودگی ہے دائمی ناآسودگی جس نے معاشرے کو گھُن کی طرح کھا لیا ہے۔

اسلم اور بلقیس ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ میں ان سے ملنے گیا تو مشورہ دیا کہ تم دونوں شادی کر لو۔ اسلم نے کہا شادی کی کیا ضرورت ہے۔ میں ایک مرد ہوں اور بلقیس ایک عورت۔ عورت مرد کا ازلی رشتہ ہے۔ اب اس رشتہ کی تجاریہ کے کیا معنیٰ۔ تم چاہتے ہو کہ میں اپنے نجی تعلقات کا اشتہار دوں۔ گلی گلی ڈھنڈورا پیٹوں تاکہ لوگ مجھے شادی شُدہ سمجھ کر بے معنی خیال کرنے لگیں۔ میں اپنی جبلّی ضرورتوں کو پُورا کرنے کی خبر سارے شہر کو دوں اس سے کیا فائدہ ہے۔ میں کھانا کھاتا ہوں پانی پیتا ہوں مگر میں نے کبھی اس کا اعلان نہیں کیا اور اب میں بالغ ہونے پر جنسی حوائج پورے کرتا ہوں۔ ایک عورت میرے بستر کی ساتھی ہے اسکا نام بلقیس ہے مگر نہیں اس کا کوئی نام نہیں۔ بستر پر وہ ایک عورت ہوتی ہے اور میں ایک مرد۔ ہم دونوں تھوڑی دیر کے لئے اکائی بن جاتے ہیں، جسم و جان، تن و رُوح، بلقیس اور اسلم تو جُدا جُدا دو فرد ہیں جو الگ الگ جسموں میں رہتے ہیں۔ انہیں ازدواجی رشتے میں پرو کر افراد کی حیثیت سے قتل کرنا ظلم ہے۔ سماجی بھی اور اخلاقی بھی۔ میں ششدر رہ گیا۔ سوچا ان دونوں کا دماغ چل گیا ہے۔ ان سے بحث کرنا لاحاصل ہے۔ فرد اور اکائی کے چکر میں پڑ کے یہ اس حقیقت کو بھول گئے کہ کائنات حسن ترتیب کا نتیجہ ہے اور زندگی ایک باہمی اشتراک۔ میں بھی خاصا منطقی ہوں۔ بحث کرنے پر آؤں تو افلاطون کو لاجواب کر دوں مگر

اسلم سے بحث کرتے ہوئے میں ہمیشہ کتراتا تھا۔ اس کے پاس عقل زیادہ تھی اور میرے پاس جذبات۔ دل اور دماغ کی لڑائی میں عام طور پر دماغ کی چولیں ہل جاتی تھیں اور اسلم ہانپنے لگتا تھا۔ بے بس سا ہو جاتا تھا۔ میں اس کی بے بسی پر ترس کھاتا تھا۔ اس کے پاس عقل اور علم ہی تو ایک دولت تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا نشہ ٹوٹنے نہ پائے۔ میرا کیا ہے میرے پاس بہت سے نشے ہیں۔ میں تو پھر سرشار ہو جاؤں گا۔

بلقیس بانجھ تھی۔ وہ اسلم سے پہلے بھی کئی مردوں کے ساتھ رہی اور اسلم کے پاس رہتے ہوئے بھی اکثر راتوں کو غائب ہو جاتی تھی۔ اسے بچہ ہونے کا کوئی خوف تو تھا نہیں جو اس قسم کی باتوں سے احتراز کرتی اور اسلم اس کی بے راہ روی کا خیال بھی نہ کرتا تھا اسلم کے گھر کے سامنے ایک ریٹائرڈ فوجی افسر رہتا تھا۔ بلقیس دو راتیں اس کے پاس گذار آئی بڈھا جب ملتا، بلقیس کا نام لے کر ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک نوعمر عیسائی لڑکے کے ساتھ رہنے لگی۔ لڑکا بھی اس پر فریفتہ تھا۔ خدا جانے بلقیس میں ایسی کیا بات تھی کہ جس کے پاس وہ دو چار دن رہ کر چلی جاتی وہ اپنا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھول کر سوتا تھا۔ کچھ ہی دن میں بلقیس آدھے شہر میں مشہور ہو گئی۔ میں نے بھی سوچا کہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھولوں مگر اوّل تو وہ مجھے اچھی ہی نہ لگتی تھی پھر یہ کہ اسلم کا خیال آتا تو ندامت ہونے لگتی تھی۔

ایک دن گرمیوں کی دوپہر میں میں اسلم کے گھر گیا۔ اسلم گھر پر نہیں تھا بلقیس کسی گرلز کالج سے تقریر کر کے لوٹی تھی۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ انڈے کی زردی کا کا رنگ کچھ کچھ چمپئی سا ہو گیا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں، کسی تپتے ہوئے ریگستان کی طرح مجھے شدت سے پیاس لگنے لگی۔ میں نے صُراحی کی طرف دیکھا تو بلقیس میرے لئے پانی لے آئی۔ اس نے ململ کا ایک ڈھیلا ڈھالا کُرتا پہن رکھا تھا۔ ٹانگوں میں مردانی وضع کا پاجامہ تھا۔ اس کا آبنوسی جسم پسینے کے گیلا گیلا ہو گیا تھا۔ صراحی سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو میری ناک میں آنے لگی۔ اس کے بال پریشان تھے اور کھجوری چوٹی کے بل ڈھیلے ہو کر نیچے کی طرف ریڑھ کی ہڈی پر پھیلتے چلے گئے تھے پنڈلیوں کے پاس بالوں کی نوکوں سے ربن گر گیا تھا اور دو لمبے لمبے سانپ پھن

اُٹھائے کھڑے تھے۔ میرے کانوں نے اُن کی جھنکار سُنی تو لو دینے لگے۔ بلقیس
میرے پاس آ کے بیٹھ گئی اور اپنی تقریر کا خلاصہ بیان کرنے لگی۔ اس کے ہونٹ
خشک تھے اور ان پر سفید سفید پپڑی جمی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال دیں۔ بلقیس بھی مجھے کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ یکایک میرا جی چاہا کہ
میں اپنے تینوں بچوں سمیت شاہدہ کو گھر سے نکال دوں اور بلقیس کے ساتھ رہنے
رہنے لگوں۔

پھر میں نے سوچا بلقیس تو اسلم کے ساتھ رہتی ہے اور اسلم میرا جگری دوست
ہے۔ بلقیس ٹھیک کہتی تھی۔ مرد ہمیشہ ایک مرد رہتا ہے۔ شوہر، باپ، بیٹا کچھ نہیں
میں بلقیس کے بارے میں یہ کیا سوچنے لگا۔

یہ کہانی میری کہانی تھوڑی ہے۔ یہ اسلم اور بلقیس کی کہانی ہے میں کہاں
بیچ میں کود پڑا۔ معاف کیجئے گا یہ میری کہانی نہیں ہے۔ یہ اسلم کی کہانی ہے۔ یا پھر
بلقیس کی کہانی اسلم اور بلقیس کی کہانی۔

ہاں بھئی اسلم اور بلقیس کی کہانی۔ سو فیصدی اسلم اور بلقیس کی کہانی۔

مکاک

گاؤں گویں اور قصبات میں دُودھ والا وہ شخص کہلاتا ہے جو صبح سویرے بالٹی اُٹھائے "دُودھ لو" "دُودھ لو" کی آواز لگا کر دُودھ بانٹتا پھرتا ہے لیکن دِلّی کا دُودھ والا بھی یہاں کے دوسرے دُکانداروں کی طرح بڑی آن بان والی ایک منفرد حیثیت کا مالک ہوتا تھا۔ صبح کا دُودھ تو اسکے چیلے چپاٹے نوکر چاکر جست کی خوشنما بالٹیوں میں پیتل کی گھنٹیوں سے ناپ کر دکان کے چبوترے پر ہی تقسیم کر دیتے تھے۔ سیر پیچھے پیسے دو پیسے کا منافع ملتا ہوگا بس یہی کافی تھا۔ اللہ بس باقی ہوس، پتلا پانی جیسا دُودھ جو جمنا کے اس پار سے دُودھیئے سائیکلوں پر لاد کر لاتے تھے وہ یونہی کا یونہی بانٹ دیا جاتا تھا۔ نہ دھوکا نہ دھڑی اگر دُودھ بُرا ہو تو جی بھر کے گائے بھینسوں کو کوسئے دِلّی کے دُودھ والے نہ ہاتھ گنے نہ پاؤں۔ اِدھر لیا اُدھر دیا۔ ان کی جانے بلا کہ دُودھ میں پانی ملا تھا یا پانی میں دُودھ۔ دِلّی والے صبح کا ناشتہ بیوڑی اور ترکاری یا حلوے مانڈے کا کیا کرتے تھے۔ غریب غربا ستو پی کر گذارا کرتے تھے اور جاڑا ہوا تو کچھ بیسی حریرہ کھا لیا پھر دِن چڑھے بس دوپہر کے کھانے سے بسم اللہ کی، دُودھ کی کھپت یہاں برائے نام ہی ہوتی تھی۔ بچھ گود کے بچے پیتے تھے کچھ دوائی ٹھنڈائی کے لئے منگایا جاتا تھا۔ البتہ شام کو دُودھ والوں کی دُکانیں دھو دُھلا کر چار بجے سے شیشے کی طرح چمکائی جاتی تھیں۔ بڑے سے آہنی کڑھاؤ میں بھٹی کی راکھ اور ابخورے کی ٹھیکریاں ڈال کر ایک نوکر اس کے بیچ کھڑا ہو جاتا تھا اور گھنٹوں اس طرح کو لہا لگاتا تھا جیسے کوئی پھوہڑ گنوارن کتھا کلی ناچ رہی ہو پھر جب یہ کڑھاؤ مانجھ کر کنارے کھڑا کیا جاتا تو خوب جگر مگر چمکتا تھا بلیجیم کی ٹکڑی کی طرح۔ ایسا صاف شفاف کہ آپ چاہیں تو اس میں اپنا منہ دیکھ لیں۔ اس کے بعد بھٹی سُلگتی تھی۔ تاؤ دیئے جاتے تھے اور کوئی من ڈیڑھ من دُودھ ہلکی آنچ پر اونٹانے کے لئے چڑھا دیا جاتا تھا۔ اِس دُودھ میں

خدا جانے کس چیز کی آمیزش کی جاتی تھی کہ رات کا ایک پہر گذرتے گذرتے یہ "لڈو کی طرح" گاڑھا ہو جاتا تھا اور کورے لٹھے کے تھان جیسی ملائی سارے کڑھاؤ پر ڈھکن کی طرح ڈھک جاتی تھی۔ بیچ میں نظر گذر سے بچنے کے لئے ایک بڑا سا کیکر کا کوئلہ یوں رکھ دیا جاتا تھا جیسے غلافی آنکھوں میں سرمے کی تحریر ہو، بعض من چلے حلوائی ورق لگا لوہے کا باٹ ملائی کی سطح پر ہلکے سے ٹکا دیتے تھے۔ اَللہ اَللہ اس آب و تاب کی ملائی کہ دیکھنے والے کی رال ٹپکنے لگے اور بے اختیار کھانے کو جی چاہے۔

خلیفہ مکاک دہلی کے دودھ والے تھے اور انہیں دیکھ کر دودھ کی بھرپور غذائیت کا بھی پورا پورا اندازہ ہوتا تھا۔ موٹا آدمی ان دنوں صحت مند تصور کیا جاتا تھا اور توند اس بات کی نشانی تھی کہ اللہ رکھے چند ٹکے بھی جیب میں ہیں۔ کھاتا پیتا آدمی ہے، کوئی قلاش نہیں۔ مکاک بھی ہر اعتبار سے بھرے پُرے آدمی تھے۔ پرکار رکھ کے دائرہ کھینچیے تو سارا جسم دائرے میں سما جائے۔ دل کی ڈبیا کو اس وہیل مچھلی کی رگ رگ میں خون پہنچانے کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑے ہوں گے اس کا اندازہ تو آج کل والے ہی خوب کر سکتے ہیں جنہیں اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے دل کے دورے پڑتے ہیں ان دنوں تو آدمی اللہ کے حکم سے مرتا تھا اور موت کا خوف ہم جیسے تھڑ دلے ہی کیا کرتے تھے۔ جس کی آئی مر گیا، اللہ اللہ خیر صلّا۔ چنانچہ اسی طرح ایک دن بھائی مکاک بھی مر گئے پھول فاتحہ ہوئیں، جمعراتیں کی گئیں اور یاد کرنے والے آج بھی ان کا نام لے کے انہیں یاد کرتے ہیں مگر وہ بیچارے اب کہاں۔ ان جیسے لوگوں کی تو پوری کھیپ ہی اس دنیا سے اُٹھ گئی۔

مکاک کو سردی بہت کم لگتی تھی۔ بھٹی کے آگے ہلکی سی سینک تو ہوتی ہی تھی۔ وہ خوب کڑکڑاتے جاڑے میں بھی ہلکی سی چادر ٹانگوں پر ڈالے اطمینان سے بیٹھے رہتے تھے۔ اُوپر کا دھڑ بے حس ہو گیا تھا اس پر جاڑے میں کرتا یا کرتے اور قمیض کے تال میل سے بنا ہوا لباس ہوتا تھا اور گرمیوں میں بس موٹی سیاہ کھال پسینہ کی بوندوں سے شہد بیز کی بیٹھ کی مانند چمکتی رہتی تھی۔ سر میں بال اتنے تھے جتنا ریگستان میں سبزہ

مگر چنبیلی کا تیل اس میں پابندی سے کھپایا جاتا تھا۔ جڑیں ہمیشہ تر دکھائی دیتی تھیں۔ آنکھ ناک چہرہ مہرہ سب اللہ کے بنائے ہوئے تھے ان کا ذکر ہی کیا کرنا۔ مرد کی صورت کون دیکھتا ہے ان کی تو سیرت دیکھی جاتی ہے۔

مکاک کا سلسلۂ نسب بقول ان کے شاہی زمانے کے حلوائیوں سے ملتا تھا۔ ان کے نانا کے سگے ماموں شہر آبادی ہیں دلّی کے آخری تاجدار کو پاؤ بھر دُودھ کا آبخورہ روز بھیجتے تھے۔ ایک زمانہ تھا دلّی کا ہر دُکاندار کچھ اسی قسم کی کہانیاں سناتا تھا۔ چمن بھڑ بھونجے کہتے تھے کہ ان کے پرکھوں نے اکبر شاہ ثانی کو بھنے کھلائے تھے تب ہی سے ان کے خاندان کے بخت جاگے واللہ عالم بالثواب۔

مکاک میاں کے دُودھ میں ایک کمال تو ہم نے دیکھا کہ چاہے وہ کتنا ہی دُودھ بیچ لیں رات کے درمیانی حصّے تک کڑھاؤ بھرا کا بھرا دکھائی دیتا تھا۔ خدا جانے پاس رکھی بالٹی میں سے پانی ملاتے جاتے تھے یا کوئی چِلّہ وظیفہ کھینچتے تھے۔ لُطف یہ کہ نہ دُودھ کا مزا خراب ہوتا تھا اور نہ قوام ہی ٹوٹتا تھا۔ ایسا ذائقہ دار کہ ایک بار منہ کو لگے تو چینے اور غلام کی طرح جیتے جی نہ چھوٹ پائے۔ ٹھنڈا کرنے کیلئے جب وہ آبخورے سے بلٹوئے میں اور بلٹوئے سے آبخورے میں چار پانچ مرتبہ دُودھ اُنڈیلتے تو ایک ڈیڑھ گز لمبی لکیر چاندی آبشار کی طرح اُوپر سے نیچے گرتی دکھائی دیتی تھی۔ اس وجہ سے ایک دیہاتی بے چارے نے ایک مرتبہ ان کی دُکان پر آکر بھولے بھولے منہ سے کہا تھا۔ پہلوان جی ایک گز دُودھ ناپ دیو۔ پہلے تو وہ سمجھے نہیں لیکن جب بات سمجھ میں آئی تو شاید اپنی زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ جی کھول کر ہنسے ہوں گے۔

مکاک نے بشیشر والوں کے اکھاڑے میں زور کئے تھے۔ ان کا جسم گینڈے کیطرح سخت تھا۔ خوب سیسہ پلایا ہوا اور کسی زمانے میں پھرتی اس غضب کی تھی کہ جب وہ کشتی لڑتے تھے تو اچھی سے اچھی جوڑ کو آناً فاناً مار لیتے تھے مگر اب دُودھ کے بیوپار نے انہیں ٹھیلا بنا دیا تھا۔ جب آدھی رات ادھر اور آدھی اُدھر ہوتی تھی تب کہیں جا کر دکان سے چھٹکارا ملتا تھا بیٹھے بیٹھے گھٹنے جُڑ جاتے

تھے اور کمر تختہ ہوگئی تھی ۔ وہ پہلا سا لوچ لچک ، چیتے کی سی پھرتی ، خدا جانے کہاں چلی گئی تھی جس کا رنگین فسانہ وہ خود ، دودھ ٹھنڈا کرتے وقت گاہک کو مزے لے لے کر سناتے تھے ۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ ہمارا دودھ پیو گے تو ایسے ہو جاؤ گے یا پھر اپنے بھلے بُرے وقت کو یاد کر کے جی بہلاتے ہوں گے ۔ ان کی نظر میں اس دور کے نوجوان خاک نہ جچتے تھے ۔ سوکھے ، سہمے ، نرے ہڈیوں کی مالا ، جیسے قحط کی پیدائش ہوں ۔ دو چُلّو خون ہی نہ دکھائی دیتا تھا ۔ چہرے دیکھو تو دیوار والیوں کے پیٹ کی طرح پیلے پڑے ہیں منحنی ہاتھ پاؤں ، کبوتر کے سینے ، مور کی ٹانگیں ، جسے دیکھئے کبک دری بنا پھرتا ہے ان کے زمانے میں دُبلا پتلا آدمی بھی کن دار ہوتا تھا نرے ڈھاک کے پتّے نہ تھے ۔ مکاک کی کلائیوں میں ایسی جان تھی کہ مست بجار کے گاؤ مکھ لگائیں تو سالا چاروں خانے چوپٹ گرے ۔

جھُوٹ بولنا مذہبی نقطۂ نگاہ سے کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو اس کی مجلسی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ جھُوٹ کے بغیر بات چیت کا لُطف ہی نہیں آتا ۔ نری پھیکی سیٹھی ، بے مزہ رہتی ہے ۔ مکاک بھی جی بھر کے جھُوٹ بولتے تھے ۔ ان کی پہلوانی تو جس نے دیکھی ہوگی وہ بے چارہ جوانا مرگی میں گیا ہوگا ۔ ہاں اس پہلوانی کے قصّے ان کی زبان سے سُنتے سُنتے پورا محلّہ عاجز آگیا تھا ۔ کسی اور نے تو شہادت دی نہیں پر وہ سناتے تھے تو ان کے جھوٹ پر بھی سچ کا گمان ہوتا تھا ۔ جالندھر کا بڑے سے بڑا پہلوان ان کے نام سے بیری کی طرح کانپتا تھا ۔ اللہ بخش امرت سر والے سے برابر کے زور ہوئے تھے ۔ لاہور میں لڑنے گئے تو ڈھیروں سونا چاندی اور ستائش کے ڈونگرے سمیٹ کر لائے تھے ۔ ایک مرتبہ کسی فرنگی پہلوان سے بھی بل کی لی تھی وہ ہندوستانی پکڑ تو جانتا نہ تھا ۔ کھلے ہاتھ پیروں والی کشتی ہوئی ۔ بھائی مکاک نے دو چار پھول جیسے گھونسے کھائے اور پھر بڑھ کے ایک مکّا لگایا تو اگلے کے ہوش اُڑ گئے ۔ تیورا کر گرا تو بکرے کی بولی بولنے لگا ۔ اس کے بعد تو ولایت میں ان کے نام کا ایسا چرچا ہوا کہ ملکہ وکٹوریہ نے بلانے کے لئے بیسیوں

ہرکارے بھیجے البتہ وہ یہی کہتے رہے کہ بڑا لو الا کھالے بڑا بول نہ بولے ۔ میں کان پکڑ کے اکھاڑے میں اُترتا ہوں ۔ کسی کو للکارنا ہمارا شعار نہیں ہے ۔ جس کی ماں نے زیادہ دُودھ پلایا ہو وہ یہاں آکر لڑے ۔ اُستاد کی اجازت کے بغیر پرائے دیس میں مسٹنڈے فرنگیوں سے گُتھم گُتھا کریں یہ ہمیں کب زیب دیتا ہے ۔ لیجئے صاحب کیا پاگل کتے نے کاٹا ہے کہ گھر چھوڑ باہر کمالات کا مظاہرہ کریں ۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا ۔ پتھر اپنی جگہ بھاری ہوتا ہے ۔ آدمی کو چاہیئے جہاں تک ہو سکے بڑائی کا کلمہ زبان پر نہ لائے ۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہمارے یہاں کے لونڈے لارے وہ فن جانتے ہیں کہ باہر والے سو دفعہ مر کے جیئں تو بھی نہ سیکھ پائیں پہلوانی کا ہنر جنابِ بُوتراب سے چلا آتا ہے اور اس کے نکتہ سینہ بسینہ اُستادوں سے ہوتے ہوئے ہم تک پہنچے ہیں ۔ خدا ان کی قبروں میں نور بھرے ۔ بھلا یہ فن انگریزوں سے لڑ کے ہم اُنہیں بھی سکھا دیں یہ ہمیں گوارہ نہیں ۔ مجھ کو ناداں نہ سمجھ ، خوب سمجھتا ہوں تجھے ایک دن بڑے رازدارانہ انداز میں کہنے لگے ۔ یاد رکھو طاقت کا مقابلہ طاقت سے نہیں کرتب سے کیا جاتا ہے ۔ ہاتھی کے تن توش کو چیونٹی مار گراتی ہے ، ہندوستانی کشتی کی ارکان جس کے پلے پڑ گئی وہ پہاڑ جیسے دشمن پر بھاری پڑتا ہے ۔ اللہ کے کرم سے ہم نے سینکڑوں کشتیاں لڑیں ۔ بہت سی ماریں اور کچھ میں برابر چھوٹے مگر آپ کی دُعا سے کوئی مائی کا لال دونوں کھوؤں کو مٹی نہ لگا سکا ۔

مکاک پہلوان اپنے ساتھ ساتھ اپنے پیر بھائیوں کے قصے بھی مزے لے لیکر سناتے تھے ۔ یک نہ شد دو شد ان کے ایک ساتھی کی ہتھیلی پر چاندی کا روپیہ رکھو تو وہ اسے دوہرا کر دیتا تھا ۔ بے چارے کو جوانی میں نظر کھا گئی ۔ ایک یار نے بھینس کی کمر پر دو ہتڑ مارا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی ۔ ایک دوست جب اکھاڑے میں اُترتے تھے تو پاؤں کا نشان مٹی پر نہ آتا تھا ۔ شیر کی طرح اُڑان کشتی لڑتے تھے ۔ ایک دوست ، تو ایسے بجلی کی طرح وار کرتے تھے کہ بڑوں ۔

بڑوں کو یہ بتانا مشکل ہوتا تھا کہ کون سی کل مارا ہے۔ افسوس ان میں سے کوئی زندہ نہیں رہا۔ زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے۔ ایک مکاک اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے ہمیں ان کی کہانی سُنانے کے لئے زندہ بچ رہے ورنہ شاید کوئی نام بھی نہیں جانتا ان نامی گرامی باکمالوں کے۔ آدمی اپنی سنگت سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ محاورہ بھائی مکاک نے ازبر کر لیا تھا۔ اسی لئے وہ اپنے ساتھیوں کا رنگ جماتے تھے اور جب ان سب کی دھاک بٹھا لیتے تھے تب کہیں صدر مقام پر اپنا ذکر یوں کرتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑتے ہوں۔ خدا کا منکر ہو تو مکاک پر ایمان لے آئے۔

سنا ہے ایک دن مکاک پہلوان کا بھوت پریت یا کسی اُوپری شئے سے مُٹھبّا ہو گیا یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ خاصے بوڑھے ہو گئے تھے۔ ہوا یوں کہ جب وہ رات گئے دکان پر بیٹھے اونگھ رہے تھے تو کوئی شخص اچھے ہاتھ پیروں والا دُودھ لینے آیا۔ باتوں باتوں میں سخت کلامی ہو گئی۔ کہتے ہیں آئی بلا ٹلا نہیں کرتی۔ یکایک پہلوان تاؤ میں آ گدّی چھوڑ کر نیچے اُتر آئے۔ خوب پٹخم پٹخا ہوتی رہی۔ کبھی یہ نیچے تو وہ اُوپر، کبھی وہ اُوپر تو یہ نیچے اُنہوں نے قینچیوں پر قینچیاں ڈالیں اور وہ یوں نکل گیا جیسے آدمی نہیں ہوا کا جھونکا ہو۔ رات کا پچھلا پہر تھا کسی نے دیکھا نہ سنا پھر بھی مکاک پہلوان کو اپنی پہلوانی کا زعم ٹوٹ گیا۔ اس دن سے ان کے لہجے کا اعتماد، بیٹھک کا دبدبہ، آنکھوں کی چمک، نگاہ کی تندی۔ زبان کی طرّاری سب بجھ جاتا رہا۔ اس واقعہ کے بعد وہ کوئی مہینہ ڈیڑھ مہینے جئے ہوں گے وقت سے پہلے موت تو آتی نہیں۔ مکاک کی جگہ مکاک کا مجسمہ بیٹھا رہا۔ البتہ وہ جولانی اور باتیں مٹھارنے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

پھر ایک دن صبح صبح نالی صاف کرنے والے جمعدار نے ہائے ویلا مچائی تو لوگ اپنے اپنے گھر سے نکل کر ان کی دکان پر اکٹھے ہو گئے۔ مکاک پہلوان اپنی دکان کے تختے پر چاروں خانے چت پڑے تھے۔

ان کی ننگی کمر کے دونوں طرف کھووں کے نیچے زندگی میں پہلی بار مٹی لگی تھی۔

کانچ کی گڑیاں

موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بجلی چمکتی ہے تو گردوپیش کا گھناؤنا ماحول بھیانک خواب کی طرح آنکھوں کے آگے ناچنے لگتا ہے۔ میرے کمرے میں ولایتی ٹین کی پرانی لالٹین روشن ہے جس کی لو تیز و تند ہوائیں یوں کانپ رہی ہے جیسے عورت اپنی دوشیزگی گناہ کی نذر کرتے ہوئے کانپتی ہے۔ روشنی سکڑتی ہے اور کبھی پھیل کے سیلی ہوئی دیوار پر یرقان کی سی زردی بکھیر دیتی ہے۔ مجھے اس ویرانگی سے خوف محسوس ہوا تو میں نے سوچا ایک کہانی کہی جائے۔ چھت کی بوسیدہ کڑی سے لٹکے قلابے میں ایک چڑیا بیٹھی ہے یہ بھی تو کہانی کا موضوع ہو سکتی ہے میرے دل میں خیال آیا اور کہانی شروع ہو گئی۔

ایک تھی چڑیا، ایک تھا چڑا۔ دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی۔ "ارے یہ تو جھوٹی کہانی ہے۔" کوئی پاس ہی سرگوشی کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ چڑیا وہاں اکیلی بیٹھی ہے۔ چڑا کہیں اور کھچڑی پکانے گیا ہے۔ خدا جانے کہاں......؟ پھر کہانی......؟

کرداروں کا پوری طرح علم نہ ہو تو کہانی کیا خاک لکھی جائے گی۔

کھڑکی کا پٹ تاریکیوں میں کھلتا ہے۔ تاریکی کے اس پار دلشاد منزل ہے۔ اکٹھے ستائیس گھروں کا مجموعہ۔ دیوار کے سوراخوں سے چمگادڑوں کا ایک غول نکلا اور اندھیرے کا طواف کرنے لگا۔ متانت بوا کی مسہری تک میری نظر پہنچی اور آبنوسی کٹہرے میں لگے نیم شفاف آئینے کے دھندلے سے عکس میں دو سایوں سے الجھنے لگی۔

متانت بوا آگرے سے بیاہ کے دہلی آئی ہیں۔ شادی ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ شکل صورت کی ایسی ہیں کہ دلشاد منزل کے ستائیس گھروں میں ان گنت لڑکیاں ہیں مگر ان کے پاس بیٹھیں تو پانی بھرنے لگیں۔ قد قامت ڈیل ڈول ہر چیز اپنی جگہ درست ہے۔ لگتا ہے اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ پر نصیب کی ذرا ہیٹی ہیں۔ روپ کی روئے کرموں کی کھائے۔ میاں نکھٹو نشے کی ترنگ سے فرصت پاتے ہیں تو ادھی پاولی کما لاتے ہیں۔ اسی میں خوب بچ اور سلیقہ کے ساتھ بے چاری گذر اوقات کرتی ہیں، اکیلا دم ہے کوئی بال بچہ ابھی ہوا نہیں جو نہوتی کا ماتم گھر کی چار دیواری سے باہر نکلے۔ بس کچھ ہوا تو کھا لیا ورنہ یونہی اللہ کا نام لے چپکی بیٹھ رہیں پہنتی اوڑھتی ذرا اچھا ہیں۔ لاہوریوں میں اوپر کی آب کو دھرم کی طرح سنبھال کے رکھا جاتا ہے۔ خدا نہ کرے کپڑے لتے سے بگڑ جائیں تو دلشاد منزل کی چنڈال عورتیں ان کا بھرم مٹی میں ملا دیں۔ خوب جیل چلو کریں۔

متانت بوا کے میاں آدھی رات گئے گھر آتے ہیں اور وہ بیٹھی انتظار کرتی رہتی ہیں۔ ذرا سی آہٹ ہوئی تو فوراً اٹھ پیش قدمی کے لئے دروازے تک آتی ہیں اور اس طرح انہیں سہارا دیکر دالان تک لے جاتی ہیں جیسے وہ آدمی نہیں کانچ کے گڈے ہوں۔ پھر ذرا دیر ان کی خدمت کرتی ہیں دالان میں پلنگ بچھا پہلے انہیں سلاتی ہیں اور پھر کمرے میں جا گھڑی دو گھڑی کمر سیدھی کرنے خود بھی لیٹ جاتی ہیں پتھر کا جگر ہو تو شق ہو جائے مگر متانت بوا کے صبر کی حد نہیں ہوتی۔ کبھی کسی کی زبان سے یہ نہیں سنا کہ متانت بوا نے جھوٹوں بھی اپنے میاں کی شکایت کی ہو۔ پڑوسنیں بیچاری اوّل اوّل تو خوب چکر لگاتی رہیں کہ یہ کچھ بولیں تو وہ نمک مرچ لگا کر اس کا افسانہ کریں مگر جب دیکھا یہ منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہتی ہیں ایک حرف نہیں اگلتیں تو انہوں نے آنا جانا بند کر دیا۔ آدمی کسی کے ہاں جاتا ہے کہ اپنا دکھ درد کہے اور دوسروں کا سنے فقط صورت دیکھنی ہو تو گھر میں گڑیاں لا رکھے۔ اکیل سے دوکیل ہو جائے گی متانت بوا تو پتھر کا بت ہیں۔ نہ منہ سے بولیں نہ سر سے کھیلیں۔ ان کے ہاں آکے بھلا کون

وقت ضائع کرے۔

متانت کے ابّا کا آگرے میں خاصا بڑا کاروبار ہے۔ اُنہوں نے جب داماد کی یہ روش دیکھی تو ہر مہینے کچھ نہ کچھ متانت کے لئے بھیجنے لگے۔ کئی بار آئے تو یہ بھی کہا کہ تجھ خصم والی سے تو نخصمی اچھی آج فارغ خطی لے اور اللہ چاہے تو ایک ہفتہ بھی نہیں لگے گا کہ تیرا گھر آباد ہوجائے گا۔ یوں کب تلک اپنی جان گھلائے گی متانت نے سختی سے انکار کر دیا اور کہا اگر میرے مقدر میں عیش ہے تو یہی بھلے چنگے ہوجائنگے شادی کوئی گڑیوں کا کھیل تو ہے نہیں کہ آج کری کل چھوڑ دی۔ اب تو اللہ چاہے اس گھر سے مر کر ہی نکلوں گی۔

میاں یوں تو اچھے خاصے پڑھے لکھے کاریگر ہیں مگر اوّل تو وہ ہوش میں ہی کب رہتے ہیں کہ روٹی روزی کی سوجھتا کریں اور اگر کبھی ہوش میں آئے بھی تو جو کچھ کمایا گھر کے باہر ہی اُڑا دیا۔ دنگئی شربت کی لت ایسی مُنہ کو لگی ہے کہ اس نے بیوی اور گھر بار سب کچھ بھلا دیا ہے۔ سنا ہے کوئی ڈیرے دارنی ان پر عاشق ہے اس نے یہ لت لگائی ہے۔ بڑی جائداد والی ہے کئی سو روپے ماہانہ تو کرائے کے آتے ہیں۔ رنڈی کا دل جس پر آجائے اسے جان تک دیدیتی ہے۔ متانت کے میاں صبح سے رات گئے تک اسی کے گھر پڑے رہتے ہیں اور اس وقت بھی کچھ بیوی کی محبت میں گھر نہیں لوٹتے بلکہ اس لئے کہ رات کے پچھلے پہر چوکی کے پولیس والے شریف آدمیوں کو پریشان کرنے لگتے ہیں ورنہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو متانت بوا کی آنکھیں دروازے کی جھریوں کی طرح شاید کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔

چڑے چڑیا کی کہانی تو ایک روایتی موضوع ہے کوئی رومانوی قصہ کہنا چاہیئے۔ زندگی روایت کے مکروہ خول میں بند رہے تو اس سے جوہڑ کے پانی کی سی بو آنے لگتی ہے۔ مجھے آسمانی دھند لکے پسند ہیں جو رومان کو جنم دیتے ہیں اور اس رات یہ دھند لکے نہ جانے کیوں ضرورت سے زیادہ گہرے ہو گئے تھے تاریکیوں میں روشنی کہاں ڈوب جاتی ہے۔ میرے ذہن میں ایک نیا سوال پیدا

ہوا۔ چھوڑیئے بھی۔ فلسفہ الجھا دینے والا موضوع ہے۔ اس اندھیری رات میں کوئی اور کہانی کہیں۔

آگے ملکِ روم میں ایک بادشاہ تھا کہ حاتم کی سی سخاوت اور نوشیرواں کی سی عدالت اس کی ذات میں تھی۔ بڑا نیک متقی، پرہیزگار اور خداترس۔ اس کی حکومت چاردانگ، مشرق، مغرب، شمال، جنوب پھیلی ہوئی تھی۔ شاہانِ ولایت، قیصر وکسریٰ اور خاقان چین سب اسی کے باجگذار تھے۔ لوگ اسے شاہ گیتی پناہ کہتے تھے۔ اس کے عہدِ حکومت میں چھوٹے بڑے، اشراف ارزل غریب امیر سب بڑے چین سے گذران کرتے اور ایسے آرام سے رہتے تھے کہ دن عید اور رات شب برات تھی۔ رعیت ہر دم آنند کے نار بجاتی تھی۔

شاہی مطبخ سے ہندوؤں کے لئے پوری کچوری، حلوے مانڈھے دال دلئے اور مٹھائیاں تقسیم کی جاتی تھیں اور مسلمانوں کے لئے قلیہ پلاؤ، شیرمال اور فرنی کے پیالے صبح شام بانٹے جاتے تھے۔ اس پر لطف یہ کہ نہ کہیں جانا نہ آنا۔ گھر بیٹھے ہرکارے آتے اور دروازے پر آواز دیکر کمخواب اور اطلس کے خوان پوش ڈھکے چاندی سونے کے تورے پہنچا جاتے تھے۔ خالی وقت اور بے کاری لوگوں کو ستاتی تو ناچ گانے ہنسی مذاق اور کھیل کود میں ایسے مگن ہو جاتے کہ انہیں اپنا بھی ہوش نہ رہتا تھا۔ اس کی فوجِ ظفر موج کا یہ عالم تھا کہ پرا باندھ کے کھڑی ہو تو سکندر کا زہرہ آب ہو جائے اور حسنِ انتظام ایسا کہ جتنے چور چکار اٹھائی گیرے صبح خیزئے تھے ایک ایک کو چن کر گردن ان سب کی ماردی گئی تھی۔ ہرگز کوئی زندہ نہ بچا تھا۔ ہندو مسلمان اس رعیت پرست بادشاہ کے حق میں دن رات دُعائیں کرتے تھے کہ اے مالک دوجہان کے تو اسے ہمارے سروں پر رہتی دنیا تک قائم رکھیو اور خود ایک دوسرے کے ساتھ گھی شکر بنے رہتے تھے۔

اس بادشاہ کی سات رانیاں تھیں۔ سب کی سب حسین چندے آفتاب، چندے ماہتاب، حور وش، پری تمثال، چاند سورج کی نظر ان پر پڑے تو انکا بدن

میلا ہو۔ پر چھوٹی رانی ذرا انوٹھی پھبن کی تھی۔ برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن، قد و قامت سرو شمشاد کی مانند، ناک نقشہ، نِک سُک ایسا درست کہ جہاں کجی چاہیئے تھی وہاں کجی اور جہاں راستی چاہیئے تھی وہاں راستی۔ سیوتی کا سا من بھاؤنا رنگ۔ نظر بھر کے دیکھیئے تو آنکھوں میں سرسوں پھولنے لگے بادشاہ سلامت کی اس رانی پر جان جاتی تھی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ بیگم کی نگاہ بادشاہ کے حبشی غُلام سے ٹکرا گئی۔ سنانِ اُلفت دل کے پار ہوا اور آتش محبت نے وہ کام کیا کہ آخرش رسوائیاں پیش قدمی کو آئیں۔ بیگم نے محلی کو سانٹھ اردا بیگنیوں قلماقنوں، ترکنوں، حبشنوں سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک رات اپنے عاشق کو چور دروازے سے عیش محل میں بلایا اور خوب دادعیش دی۔ پھر تو یوں ہونے لگا کہ جن دنوں بادشاہ سلامت دوسری رانیوں کے ساتھ شب گذاری کرتے، چھوٹی رانی حبشی غلام کو طلب کر کے خوب گل چھرے اڑایا کرتیں۔ کسی جاسوس نے ڈرتے ڈرتے اشاروں کنایوں میں یہ خبر بادشاہ کے کان تک پہنچادی اور جان کی امان چاہ کر عرض کیا۔ حضور! عورت گھوڑے اور تلوار پر اعتبار کرنا سراسر نادانی ہے۔ آپ مطلق ملال نہ کریں۔ بیک جنبشِ چشم اس سے بڑھ کر حسین اور طرح دار معشوق آپ کے پہلو میں لا بٹھا دی جائے گی اور وہ نابکار، عیش و آرام، نوکر چاکر، محل دو محلے چھوڑ اپنی قسمت کو رویا کرے گی، نون والی کا نون گرتا ہے تو وہ سمیٹ لیتی ہے تیل والی کا تیل گرے تو وہ نہیں سمیٹ سکتی۔ بادشاہ کو رنج تو بہت ہوا۔ تن بدن میں آگ لگ گئی مگر یہ سوچ کر چپکے ہو رہے کہ جو میرے جی کے اندر ہے سو بیان سے باہر ہے۔ البتہ دل ہی دل میں گھٹنے لگے۔

بڑے زور سے کڑک ہوئی۔ شاید کہیں بجلی گری ہے۔ کمرے کے دروازوں سے چمگادڑیں نکلیں اور تیز تیز چکر کاٹنے لگیں۔ تلابے میں بسیرا کرتی چڑیا اڑی اور دیواروں سے ٹکرا کر فرش پر آن گری۔

موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بجلی چمکتی

ہے تو گرد و پیش کا گھناؤنا ماحول بھیانک خواب کی طرح آنکھوں کے آگے ناچنے لگتا ہے۔ میرے کمرے میں ولائیتی ٹین کی پرانی لال ٹین روشن ہے جس کی لو تند و تیز ہواؤں میں یوں کانپ رہی ہے جیسے عورت اپنی دوشیزگی گناہ کے سپرد کرتے ہوئے کانپتی ہے روشنی کبھی سکڑتی ہے اور کبھی پھیل کے سیلی ہوئی دیوار پر یرقان کی سی زردی بکھیر دیتی ہے۔

سڑک کی روشنیاں کھمبوں سے اُتر کے تاریکیوں میں گم ہوگئی ہیں۔ دلشاد منزل کے نیچے برآمدوں اور چھجوں میں ریزرو پولیس کے آدمی پڑے ہیں۔ فرقہ وارانہ فساد کا خطرہ ہے۔ سامنے والے کھنڈر میں اُلو آن بسا ہے۔ بارش نے زندگی کی بساط اُلٹ رکھی ہے ورنہ یہاں بجلی کے کھمبوں کی روشنی میں پچیسی ہوتی ہے، کوڑیاں گالی کھا کھا کے "پو" لاتی ہیں۔ اس خنک رات میں مجھے لگتا ہے کہ میرے کان کے قریب ہزارہا مردانے اور زنانے آلات تناسل بھنبھناتے پھر رہے ہیں۔ برسوں کی گالیاں فضا میں منجمد ہو کے رہ گئی ہیں جن کی بازگشت آج کے سناٹے کو بڑا ہولناک کئے دیتی ہے۔

رمضانی نے تندور بند کیا تو اس کی دُکان کے سیلے ہوئے کواڑ اس طرح چرچرائے کہ دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہزار توپوں کی سی گھڑگھڑاہٹ ہوئی۔ منحنی سے چوکیدار کی باریک صدا بوندیوں کی تال پر رقص کرنے لگی۔ خبرداری سے، ہوشیاری سے جاگتے رہو........ جاگتے رہو۔ پولیس کا دیہاتی نوجوان بڑے زور سے کھانسا کسی نے بیڑی سلگانے کے لئے اپنے ساتھی سے ماچس کی ڈبیا مانگی خلیفہ ایوب برف والے نے ایک زوردار آوازہ کسا اور اس کے جواب میں بڑی فحش گالی بکی گئی۔

خلیفہ جی کی پانچ بیٹیاں ہی جوان کی بیوی کے ساتھ دلشاد منزل کے ایک حصّہ میں رہتی ہیں۔ چار اچھی طرح جوان ہیں اور پانچویں ہاتھ پاؤں نکال رہی ہے۔ خلیفہ ایوب اپنی جوانی کے دنوں میں زردوز تھے۔ ان کی جوانی ڈھلی تو زردوزی کا پیشہ بھی ختم ہوا انسان کو جینے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ سو یہ برف بیچنے لگے۔ دو ڈھائی روپے روز کما لیتے ہیں اور اس کا آٹا خرید کر گھر بھیجتے ہیں تو وہاں سے لگا ن

سمیت دو روٹیاں ان کے لئے بھی تانبے کے قلعی دار کٹوردان میں دکان پر آجاتی ہیں لگاون کہاں سے آئی یہ سوال ان کی عقل سے پرے کا ہے ۔بیوی کا سلیقہ سمجھتے ہیں ۔ اِدھر اُدھر سے اڑتی اڑاتی کوئی خبر اپنے گھر کے بارے میں ان کے کان تک آئے تو انہیں ذرہ برابر پرواہ نہیں ہوتی ۔ بہرے بن جاتے ہیں ۔ اس میں فائدہ ہے ۔پرواہ کرنے سے کیا ہوگا ۔ اوّل اوّل جب محلے کے دو چار کماؤ پوتوں پر نگاہ رکھی اور ان سے ربط ضبط پیدا کیا کہ دو ایک بیٹیوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں تو محلے میں کانا پھوسیاں ہونے لگیں کہ خلیفہ جی اپنی بیٹیوں کی دلالی کرتے ہیں ۔ غیرت مند آدمی تھے ۔ ہمیشہ کے لئے چپ ہو گئے اور انہوں نے سب کچھ قسمت پر چھوڑ دیا ۔ کانٹوں بھری راہ چلنے سے بہتر ہے کہ سایہ دار درخت تلے سُستایا جائے ۔ دوسرے یہ کہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے ۔خلیفہ جی اب اپنے گھر نہیں جاتے ۔ دکان پر ایک پرانا کمبل منگا کے ڈال لیا ہے دن میں برف بوریوں تلے رکھ کر سلیوں کو اُوپر سے کمبل اُڑھا دیتے ہیں اور رات کو ذرا سا تختہ جھاڑ کہیں کمبل بچھا منڈکری مار لیٹ جاتے ہیں پھر جب تک نیند نہیں آتی ۔ انکی آوازہ کشی کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔بڑے گلیر آدمی ہیں ۔ اچھی بُری چیز کا نام یوں منہ سے نکلتا ہے جیسے خالی وقت میں اپنے پچکے ہوئے گالوں کے بیچ اسی کو کھلاتے رہے ہیں ۔

دلشاد منزل کے نچلے گودام میں رمضانی بھٹیارے کی دکان ہے اس کی ایک بیوی اور گیارہ بچے ہیں ۔ بے چارے کا پیشہ ایسا بُرا ہے کہ بیوی سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی ۔ صبح اوّل وقت سے لے کر رات گئے تک روٹی پکاتا ہے جب چولہے کو ایندھن اور ہانڈی کو بھینس کا گوشت فراہم ہوتا ہے ۔بھٹیارن گھر میں پڑے پڑے اکتا کر جوان دیوروں سے دھول دھپا کرتی ہے اور رمضانی نے آٹا گوندھنے پر ایک گرڈھوالی لونڈا رکھ لیا ہے ۔ ہاں کرفیو یا فسادات میں دُکان بند رہتی ہے تو گھر کا دھندا چلتا ہے اور رمضانی کو خالی بنئے کی طرح اس کوٹھی سے دھان اس کوٹھی میں کرنے پر آمادہ ہونا ہی پڑتا ہے ۔تب اس کے گیارہ بچے اندر کے حالات سے پوری طرح باخبر گلی کے نکڑ پر سرنگ لال کٹوری کھیلتے ہیں ۔ رمضانی کا کل خاندان ایسے ہی ہنگاموں کی پیداوار

ہے ۔ ورنہ اس کا بس چلے تو بیوی کو پُن کر کے رات دن گھر ٹھوالی چھو کر ے کے گوندھے ہوئے آٹے سے تندور کے پاس بیٹھا روٹی پکاتا ، اور بھٹیاری بیٹھی بے چاری گڑ گڑا گڑ گڑا کے فسادات ہونے یا کرفیو لگنے کی دعائیں مانگتی رہے ۔

دلشاد منزل میں ستائیس گھر آباد ہیں اور ہر گھر ایک قبیلہ ہے یہاں بچے ساتویں سال بالغ ہو جاتے ہیں ۔ انہیں رات کا اوّل حصّہ شادی شدہ بھائیوں اور ادھیر عمر کے والدین کی سہولت کے پیش نظر چوراہوں پر گذارنا پڑتا ہے ۔ گرمیوں کی راتیں کنواریوں پر قیامت بن کے آتی ہیں ۔ رات بھر گھڑوں اور کٹوروں کی جھنکار سے نوجوانوں کے اعصاب میں جل ترنگ بجتی رہتی ہے ۔ سہاگنوں کو درو پدی کی طرح جینا پڑتا ہے اور بیواؤں کا دُکھ درد اس طرح بٹ جاتا ہے کہ اپنی بیوگی کا احساس تک نہیں ہونے پاتا ۔

اشرف کی اماں عجیب قماش کی بیوہ ہیں ۔ میاں کے بعد انہوں نے خود کو بھی مرا ہوا سمجھ لیا ۔ یوں دیکھئے تو ابھی ان کا بگڑا ہی کیا ہے ۔ سہاگ کے پھول بھی تو باسی نہیں ہوئے تھے کہ میاں نے ساتھ چھوڑ دیا ۔ خلقت کی گرمی سے چہرہ ہر دم بھبھوکا سا رہتا ہے اور بدن دیکھئے تو بھابھڑ کے بان کی نئی کِیلی چارپائی کی طرح ایک دم کسا کسایا ۔ ذرا جھول کا نام نہیں رنگ روپ ایسا اجلا کہ دودھ کی نہر پڑی موجیں مارتی ہے اور آنکھوں کے گلابی ڈورے تو بس شربت کے گھونٹ ہیں ۔ دیکھے سے سیرابی ہوتی ہے قد قامت ایسا جیسے کوہسار پہ چڑھتا ہوا دن ہو ۔ دلشاد منزل کے صاحب خیر جتنے بزرگ و خورد ہیں سب ان کی بیوگی پر ترس کھاتے ہیں مگر وہ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتیں ۔ اشرف ایک دُکان پر ملازم ہے ۔ دکاندار اشرف کے اَبّا کے دوست ہیں ۔ ان کی خیر خواہی سے دال روٹی عزت کے ساتھ میسر آجاتی ہے ۔ اشرف کی اماں ملنے جلنے کے معاملے میں بڑی حسیس ہیں ۔ اچھے دن دیکھے ہیں اس لئے ان بُرے دنوں میں گھر کی چار دیواری کو غنیمت سمجھتی ہیں ۔ پھر یہ کہ انہیں اپنا آپا لوگوں کی نگاہ سے یوں چھپانا پڑتا ہے جیسے بلّی اپنے بچوں کو بلّے سے چھپاتی ہے ۔ ذرا کوئی دیکھتا ہے تو جان کا لاگو ہو جاتا ہے آدمی کیسا ہی اکھڑا اکھڑا ہو جینے کے لئے کسی سے تو ملنا ہی پڑتا ہے اشرف کی اماں نے دیکھا کہ متانت بوا کے گھر میں کوئی مرد تو ہوتا نہیں ۔ ان کے میاں رات

کے پچھلے پہر کو گھر لوٹتے ہیں۔ عورت بھی ذرا رکھ رکھاؤ کی ہیں، پہننے اوڑھنے کے سلیقہ سے بھلے گھر کی معلوم ہوتی ہیں سو اوّل اوّل ان کے ہاں ذرا دیر کو آنا جانا شروع کیا اور پھر یہ تعلقات اِتنے بڑھے کہ دیکھنے والوں کو حسد ہونے لگا۔ دن بھر میں جس وقت دیکھیے اشرف کی اماں متانت بوا کے ہاں موجود ہیں۔ رات کو اشرف کھانا کھا کے جلدی سے سو جاتا تو وہ بلّی لگا آہستہ سے متانت کے ہاں چلی آتیں اور گھنٹوں وہیں پڑی رہتیں۔ دلشاد منزل کے ستائیس گھروں کو یہ دوستی ایک آنکھ نہیں بھاتی مگر وہ اس میں کر ہی کیا سکتے ہیں۔ بڑی بے بسی کا عالم ہے کوئی ایسی ویسی بات ہو تو ضرور پر کو کوّا بنائیں مگر یہاں تو متانت کے میاں بھی کم بخت گھر سے اجڑے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دل میں بخارات ہونے کے باوجود سب کے مونہہ کلے پڑے ہیں۔ یوں وہ اشرف کی اماں اور متانت بوا سے اپنی نفرت کا اظہار ناک بھوں چڑھا کے ضرور کرتے ہیں اور کچھ بس نہ چلے پر آپ اپنا منہ نوچنے لگتے ہیں۔ دنیا میں شریف بن کے رہنا کوئی مذاق تو ہے نہیں آتے جاتے کی ٹھوکر سہنی پڑتی ہے۔ دلشاد منزل جن لوگوں کا مسکن ہے وہ فطرت کے خلاف یہ رکھ رکھاؤ بھلا کیسے برداشت کرلیں۔ پچھ نہ کچھ کہے جاتے ہیں جس نے متانت بوا کا جینا اور بھی دوبھر کر دیا ہے۔

کھڑکی کا پٹ تاریکیوں میں کھلتا ہے۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا۔ تاریکی کے اس پار دلشاد منزل ہے۔ اکھٹے ستائیس گھروں کا مجموعہ دیوار کے سوراخوں سے چمگادڑوں کا ایک غول نکلا اور اندھیرے کا طواف کرنے لگا۔ متانت بوا کی مسہری تک میری نگاہ پہنچی اور آبنوسی کٹہرے میں لگے نیم شفاف آئینے کے دھندلے سے عکس میں دو سایوں سے اُلجھنے لگی۔

بڑے زور سے کڑک ہوئی اور ایک کوندا لپکتا ہوا متانت بوا کی مسہری پر لوٹنے لگا۔ اشرف کی اماں گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئیں اور ان کے برہنہ جسم کا رواں رواں چندھیا دینے والی تیز روشنی کی آبشار میں نہا گیا۔ متانت بوا کے حبشی غلام جیسے سیاہ اور چمکدار بال سفید دوسوتی کے تکیہ پر اس طرح بکھرے ہوئے تھے جیسے بارش

کے بعد آسمان پر بادلوں کا ہلکا ہلکا دھواں دوڑتا ہے۔ کھڑکی کے پٹ آپ ہی آپ بند ہو گئے۔ میرے کمرے کی چھت کے قلابے میں بیٹھی چڑیا اُڑی اور دیواروں سے ٹکرا کر فرش پر آن گری۔

موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بجلی چمکتی ہے تو گرد و پیش کا گھناونا ماحول بھیانک خواب کی طرح آنکھوں کے آگے ناچنے لگتا ہے۔ میرے کمرے میں ولائتی ٹین کی پرانی لال ٹین روشن ہے جسکی لو تند و تیز ہوا میں یوں کانپ رہی ہے جیسے عورت اپنی دوشیزگی گناہ کی نذر کرتے ہوئے کانپتی ہے۔ روشنی کبھی سکڑتی ہے اور کبھی پھیل کے سیلی ہوئی دیوار پہ یرقاں کی سی زردی بکھیر دیتی ہے۔

ایک شہر کی کہانی

یا فقرا! آج اپنے تئیں آپ لوگوں کے درمیان پاکر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ایک نئی روح میرے قالبِ مردہ میں پھونکی گئی ہو۔ میں اپنے جسمِ ناتواں میں حرارت کی ایک تازہ لہر محسوس کر رہا ہوں۔ آؤ، میرے غریب خانے کی سیر کرو۔ تم تو میرے اپنے ہو تم سے کیا پردہ ہے۔ وہ دیکھو میرے دالان کی محرابوں کا چونا جھڑ گیا ہے۔ پاکھے جُھکے ہوئے ہیں۔ بغلی کمرہ سیل اور اندھیرے سے اتنا بھر گیا ہے کہ اَب میں آپ لوگوں کو اس میں بیٹھنے کی دعوت بھی نہیں دے سکتا۔ ذرا میرے ساتھ اُوپر چلیئے باورچی خانے کے برابر سے زینہ چڑھتا ہے۔ اکیس سیڑھیاں ہیں۔ چھت جگہ جگہ سے نیچے دب گئی ہے۔ کڑیاں جھونک کھا گئی ہیں۔ میری حیثیت اَب ایسی نہیں کہ اِس جہاز جیسے مکان کی مرمت کا بار اُٹھا سکوں۔ سفیدی اور روغن کرانے کا بیونت نہیں تو مرمت کیا خاک لگواؤں گا۔ کرایہ داروں نے جو حصّے ہتھیا لئے ہیں ان کا ایک پیسہ کرایہ نہیں ملتا۔ آدھی بات کہو تو سر پھٹوّل پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ سارے شہر کا یہی حال ہے۔ گلیاں، چوک، محلّے سب ایسے ویران ہو گئے جیسے کبھی آبادی نہ تھی۔ یوں دیکھنے کو۔۔۔ بستی بھری پڑی ہے مگر وہ پہلے جیسی صورتیں کہاں بڑے بڑے صحن جن میں کنبے کے کنبے لمبی تان کر سوتے تھے اور رات بھر چاندنی کھیت کرتی تھی، خدا جانے زمین نگل گئی یا آسمان۔ اب فقط چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں ہیں۔ کابکیں جن میں یوں منہ اوندھائے پڑے رہیئے جیسے جہنمی اپنی قبر میں لیٹے ہوں۔

اے عزیزوں! سامنے جو اُونچی سی کنگنی آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہ لاٹھ صاحب کے مکان کی ہے۔ اسی کے برابر میں ڈپٹی صاحب کی حویلی تھی۔ پوری گلی میں اُوپر والے

ست گھرے کو چھوڑ کر کل بیس بائیس مکان ہیں بھاگوان کا پیرا ہے۔ خلقت کا اژدہام ہے۔ جامن، بیری، پیپل سب کاٹ دیئے گئے۔ انار کے جھاڑ، چنبیلی کی چڑھتی بیلیں گیندے کے تختے، گلاب، داؤدیاں ایسی روپوش ہوئیں کہ انہیں دیکھنے کو اس شہر کے باسیوں کی آنکھیں ترس گئی ہیں۔ صحن، چبوترے، حوض، سہ دریاں، شاگرد پیشے، کیاریاں، روشیں، بالا خانے، گھدار کمرے، میدان کی میدان چھتیں، مہتابیاں سب کے سب خیال اور خواب بن کے آنکھوں کے دریچوں میں پھرتے ہیں۔ کیا تھا اور کیا ہوگیا یا وہ زمانہ تھا کہ گلیاں صندل کی تختیوں کی مانند صاف ستھری تھیں نالیاں شفاف پانی کے چشموں کی طرح بہتی تھیں۔ اَب یہ عالم ہے کہ ہر طرف گندگی کے پوٹ ہیں اور سارا شہر تعفّن سے یوں بھر گیا ہے، کہ ناک نہیں دی جاتی۔ سانس لینے میں تامّل ہوتا ہے خلق کی کثرت نے راہ باٹ میں وہ ٹھٹھ کے ٹھٹھ کھڑے کئے ہیں کہ آدمی دو گام نہیں چل سکتا، جو جس جگہ ہے وہیں کا وہیں کھڑا رہے۔ ہر شخص پتھرا گیا ہے اور سارے شہر پر جمود کا عالم طاری ہے۔ ہم سب آسمان اور زمین کے درمیان ایک طلسمی کارخانے میں قید کر دیئے گئے ہیں۔ بڑی گھٹن طاری ہے۔ ہر شخص تھُڑی تھُڑی پکارتا ہے۔ ضیق میں مبتلا ہے۔

اتنا کہہ کے وہ فقیر زار و قطار رونے لگا اور آنسو اس کی آنکھوں سے یوں رواں ہوئے کہ ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ کفنی سیاہ جو گلے میں پڑی تھی اشکوں کی روانی سے تربتر ہوگئی۔ پس ایسا غوغا بلند ہوا کہ دیکھنے والوں کے کلیجے شق ہو گئے۔ لوگ جتنے ارد گرد موجود تھے اس کے اندوہ میں شرابور ہو گئے اور سب نے اس کی دلجوئی کا سامان بہم پہنچایا مگر وہ بندۂ خدا پیہم روتا رہا۔ اتنا رویا اتنا رویا کہ ندی نالے اس بستی کے اپنی حدوں سے تجاوز کر گئے اور باڑھ کے آنے کا خطرہ لاحق ہوا۔ تب ایک پیر مرد نے آگے بڑھ کر اسے تسلی دی اور باآواز بلند کہا کہ اے دوست جانی! اب رونے سے احتراز کر کہ بہت رونا خوب نہیں۔ عاشقوں کے نزدیک مرغوب نہیں۔ آنکھیں تیری مثل اندھے غاروں کے بے نور ہو گئی ہیں اور

اِس شہر کے لوگ تیری داویلا سے تنگ آگئے ہیں۔ پس سبب تیرے گریہ کا سوا میرے کوئی نہیں جانتا کہ ان سب نادانوں کے بیچ ایک میں ہی دانا ہوں اور فرزانہ ہوں۔

درویش کو اس پیر مرد کے کلمات سے طمانیت حاصل ہوئی اور وہ اپنی چھوٹی سی گڑگڑی نکال کر سلفہ اسی میں رکھنے لگا۔ بعد چند ثانیوں کے آگ روشن کی اور دم اس چلم کا اتنی زور سے کھینچا کہ رگ رگ میں سرور آگیا۔ آنکھیں جو ابر آلود مطلع کی طرح دھندلا گئی تھیں۔ نشے کی گرمی سے تابناک ہوگئیں اور سانس مانند لوہار کی دھونکنی کے تیز تیز چلنے لگا۔ تب اس کے گرد بیٹھے ہوئے فقیروں نے کہا کہ اب تو اپنی داستان ابتدا سے بیان کر اور پہیلیاں نہ بجھوا کہ رات اَب جوان ہو رہی ہے اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے قصّے کا لطف دو چند ہو جائے گا۔

فقیر بولا میں رہنے والا اسی دیار کا ہوں جسے آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اجداد میرے پیدل چل کے افتاں وخیزاں اس سرزمین کے کنارے پہنچے تھے اور خیمے نصب کر کے یہاں پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ ان دنوں آبادی کم ملک وسیع اور خزانے وافر تھے۔ والئ ملک نے جب دیکھا اور کارندوں خبر رسانوں نے اسے ہماری آمد سے باخبر کیا تو اس نے سردار ہمارے کو طلب کر کے پہلے اس کی خاطر خواہ پذیرائی کی اور پھر ہم سب کے تئیں یوں کہلا بھیجا کہ بندگانِ خدا جو چھتر چھایا میں ہماری معہ اپنے خاندانوں اور مال و اسباب کے حاضر ہوئے ہیں، بے خوف و خطر بود و باش اختیار کریں جتنے صناع، کاریگر، اہلِ کمال ان کے درمیان ہونگے انہیں شرفِ خاص خدمتِ بادشاہ عالی مقام، امرار، رؤسار اور ارکان سلطنت کا عطا کیا جائے گا اور چھوٹی امت، پیشہ وران، کرکمین اطرافِ شہر میں اپنا اپنا کام کر کے روزی حاصل کریں گے۔ الغرض مزاحم ان کے حیلے میں جو باشندہ قدیم یہاں کا ہے ہرگز نہ ہوگا یہ پیغام قافلے والوں نے سنا تو ان کے چہرے مثل ستارہ ہائے سحری کے دمکنے لگے اور دل ان کے بارگاہِ ایزدی میں گڑگڑائے کہ اے مالک دوجہاں تو اس نیک طینت فرخندہ

خصال حکمران کی حکمرانی مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک خطہ زمین پر پھیلا دے۔ جب تک چاند اور سورج میں روشنی اور گنگا جمنا میں پانی رہے اسے ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھیو۔ اتنا کہہ کے فقیر نے ایک لمبی سانس کھینچی اور یوں گویا ہوا کہ اے عزیزوں بعد ایک مدّت کے ناگہاں سمت مغرب سے سگ ہائے ناہنجار اِس بستی میں آن وارد ہوئے۔ ہر چند یہاں والوں نے ان کی آمد پر ناک بھوں چڑھائی اور دلیل پیش کی کہ نوح کی کشتی کو ڈبونے والے یہی بدبخت بد اطوار تھے۔ لیکن چند ناعاقبت اندیش ان کی حمایت میں کھڑے ہو گئے۔ اس وقت پورے قبیلے میں نفاق کے ڈر سے بات کو رفع دفع کیا گیا اور جتنے اہلِ بصیرت، دانا، ہوشمند، تھے مَوقع کی نزاکت کو بھانپ کر خاموش ہو رہے۔ پھر اُنہوں نے قبائیں اپنے جسموں پر چست کر لیں مبادا کتوں کی موجودگی سے وہ پلید ہو جائیں اور ان کے اس زمین پر اینٹ، پتھر، گارا جو میسّر آیا اس سے طرح وضع کے مکان تعمیر کئے گئے اور آناً فاناً گنجان آبادی ہو گئی۔ گلیاں، کوچے بازار اس کثرت سے وجود میں آئے کہ خلقت انبوہ در انبوہ کھنچی چلی آتی تھی۔ دیکھتے دیکھتے سارا شہر آدمیوں سے بھر گیا۔ تل دھرنے کی جگہ باقی نہ رہی۔ سب میل ملاپ بھائی چارے اور محبت سے رہنے لگے۔ ایک کے دُکھ میں ایک شریک تھا۔ اشیاء خوردنی کی ایسی فراوانی تھی کہ آدھی پاؤلی میں پورے کنبے کا پیٹ بھر جائے۔ کنبے ماشاءاللہ بڑے تھے کیونکہ اِن دنوں آبادی کے بڑھنے پر قدغن نہ لگا تھا جس میں جتنی وسعت ہو اور توفیق کفالت کرنے کی رکھتا ہو۔ اتنا کنبہ بڑھا لے۔ کسی کو چنداں سروکار نہیں، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب کے سب گھی شکر تھے۔ ایک دوسرے کے گھر بیاہ بارات میں آن براجمان ہوتے تھے اور غم و اندوہ میں مل جُل کر دُکھ بانٹتے تھے۔ قلیہ، پلاؤ، پوری کچوری، جو جسے میسر آتا بے تکلف پروس دیتا تھا۔ سو ان کتوں کو بھی دستر خوان کے ٹکڑوں سے طرح طرح کی نعمتیں کھانے کو ملیں اور یہ پھول کر کپّا ہو گئے۔ گلی گلی دِن رات ڈونڈائے پھرتے تھے اور دیوڑھیوں سے کثیر غذا انہیں میسّر آتی تھی تو بھی سیری نہ ہوتی تھی۔ پھر نسل ان نامرادوں کی چار سو پھیلنے لگی اور اتنی بڑھی کہ ہر طرف یہ اور ان کے

لوارے دکھائی دینے لگے۔
اتنا کہہ کے وہ درویش سفید ریش یکایک خاموش ہو گیا اور تھوڑی دیر رک کر بولا آگے داستان الم انگیز ہے۔ مجھے اس محفل کو منغّص کرنا منظور نہیں اس لئے زبان اپنی کو لگام دیتا ہوں۔ ہاں اگر کچھ دن اور عمر میری نے وفا کی۔ نفس کی آمد و شُد کا سلسلہ جاری رہا اور شہر میرا سنورنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ناچار زبان اپنی کو کھولوں گا کتوّں کی مداخلت سے جو نقصان میرے احباب نے اٹھایا ہے اِس کا فسانہ بیان کروں گا۔ شب بخیر کہہ کے اس نے ٹانگیں پساریں تو برابر کے بستر سے دوسرے فقیر نے سوال کیا۔ اچھّا بھائی اتنا اور بتا دو کہ کتوّں کی سنگت سے آدمی کی خصلت میں کیا فرق نمودار ہوا۔
پہلا درویش کھانستے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں کو بہ مشکل کھول کر اس نے دوسرے فقیر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بولا۔ یا اخی! تو نے یہ نکتہ کہاں سے پایا۔ مقرر تو ان کوائف سے واقف ہے جو میں آگے بیان کروں گا۔ دوسرے درویش نے لاعلمی کا اظہار کیا اور ایک بار پھر تملّق کر کے استفسار کیا۔ تب پہلے فقیر نے بیان کیا کہ آدمیوں نے اپنے درمیان لکیریں کھینچ ڈالیں انسان اپنی اپنی سرحد کو پہچاننے لگا۔ سنگ و خشت، در و دیوار اور راہ باٹ سب ان کی ملکیت قرار پائے۔ انجانے قدموں کی آواز سن کر اَب وہ پیش قدمی اور استقبال کرنے کے بجائے بے تکان غرانے لگتے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ شہر میں ہر گھڑی ہنگامہ بپا رہنے لگا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ لوگوں کے دانت لمبے اور نکیلے ہو گئے۔ چہروں پر وحشت برسنے لگی اور سب ایک دوسرے کو بھنبھوڑنے لگے۔ جسم فربے اور بھدّے ہو گئے۔ ان کے قیمتی اور بے داغ لباسوں پر سُرخ رنگ کے دھبے اُبھر آئے۔ چمڑی خارش زدہ لال اور لہولہان ہو گئی۔
یکبارگی آندھی پچھم کی طرف سے ایسی اُٹھی کہ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اس سمے اے عزیزان شیاطین لعین نے جو کتوّں کا روپ دھار کر بستی میں نمودار ہوئے تھے بھائی بھائی میں نفاق پیدا کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ تلواریں نیاموں سے باہر آگئیں اور ایک دوسرے کا لہو چاٹنے لگیں۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک کی شہ رگ

دوسرے نے تلوار رکھ کے چاہا کہ اس کا سر تن سے جُدا کر دے تو زمین کا سینہ پھٹ گیا اور وہ دھرتی جس نے کبھی ہم کو پناہ دی تھی ہمارے لئے اجنبی دیار بن گئی۔ قیامت کا منظر بپا ہوا۔ بھائی بہن، ماں باپ، دوست احباب، سب کو ایک سیلاب بلا اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ وہ دن اور آج کا دن میں اس شہر کی ایک ایک اینٹ کو حسرت کی نگاہ سے تکتا ہوں اور وہ دن دیکھنے کو میری آنکھوں کی خشک سوتیں ترس رہی ہیں جب یہاں اگلی رونقیں واپس آئیں گی۔

اِتنا کہہ کے وہ درویش خاموش ہوا اور سب بیک آواز بولے۔ آمین۔

پھر سب نے پلٹ کر درویش کی جانب رجوع کیا اور چاہا کہ مزید تسلی اس کو دیں تو ناگہاں اس کا سر اس کے تن سے جُدا ہوا پایا۔ سب کے سب دم بخود رہ گئے کہ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے۔

فَاحِشہ

دسمبر کی سرد رات کے سناٹے میں دور سے آنے والی تانگے کی چرخ چوں اور ساز کی ہلکی ہلکی جھنکار نے مرزا دودھ والے کو تھوڑی دیر کے لئے دم بخود کر دیا اور وہ گنٹی سے دودھ ناپتے ناپتے آب خورہ ہاتھ میں لئے مٹی کے مادھو کی طرح ایک دم ساکت ہو گئے پھر جب گاہک نے ان کی اونگھ پر ہلکا سا چھینٹا کسا اور نامراد افیم کا عقدہ کھولا تو وہ چونک کے دوبارہ کڑھاؤ سے دودھ نکالنے لگے۔ "بھائی جان آج بڑی سردی ہے"۔ اُنہوں نے اپنی ٹانگوں پر پڑے ملٹری کے کمبل کو ناف تک سرکاتے ہوئے غنغنے بھتنے کی طرح کہا اور ڈھاک کا پتہ ڈھک آب خورہ گاہک کے ہاتھ میں تھما دیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کے منہ سے چھری پھرے بکرے کی طرح خرخر کی آواز نکلنے لگی اور ملٹری کا کمبل پھسلتے پھسلتے چڈھوں کے بالائی گوشوں پر آن ٹکا ناف کا گولا بدستور برسات میں گندی مٹی سے اُگی چھتری کی طرح چمکنے لگا۔ ان کی ناف کوئی ایسی ویسی ناف تو تھی نہیں ایک وسیع دائرے کا مرکز تھی اور یہ دائرہ دن بدن پھیلتا جاتا تھا یہاں تک کہ اَب بڑے سے بڑے سائز کا بنیان بھی اس پر منڈھنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے موٹے کھاردے کی بنڈیاں پہننا شروع کر دی تھیں جن کے اگلے بٹن ان کے پساندھے منہ کی طرح ہر وقت کھلے رہتے تھے ان کا سینہ موسموں کی شدت سہتے سہتے شاید بالکل بے حس ہو گیا تھا ویسے بھی اس پر منڈی کھال بڑی موٹی اور گھٹی ہوئی تھی جیسے ان کے کڑھاؤ کی ملائی جس پر وہ ہر شام لوہے کا پوسیری بٹا اور ایک بڑا سا کیکر کا کوئلہ نظر گذر کے لئے رکھ دیتے تھے۔ اس ملائی کے نیچے ان کے خاندانی نسخے سے بنا دودھ اور پانی یا پانی اور دودھ کا مرکب ہوتا جو ان تک سینہ بسینہ

پہنچا تھا۔ اس نسخے کا کمال یہ تھا کہ مرزا کے کڑھاؤ میں اوّل رات جتنا دودھ ہوتا بکتے۔ بکتے رات گئے تک اس سے کچھ زیادہ ہی ہو جاتا تھا اور ملائی بھی کوئی بالشت بھر جگہ چھوڑ تانبے چینی کی چینی کی طرح سفید سفید سارے کڑھاؤ پہ ڈھکی رہتی تھی۔ کوئی ایک ڈیڑھ بجے کے قریب جب محلے کے شوقین لوگ بھیروِیں سروں میں کوئی بے ہودہ گانا الاپتے یا مادرزاد گالیوں کے ریاض کرتے گھر لوٹتے تو ذرا دیر مرزا کی دکان پہ ٹھیکی لے لیتے تھے۔ پاؤ ڈیڑھ پاؤ دودھ بھی نہ پئیں تو صحت کیسے ساتھ دے گی۔ محنت مزدوری کرتے ہیں اس لئے جسم میں جان ہونا ضروری ہے اور ابھی انہیں سونا تھوڑی نصیب ہوگا۔ گھر والی کی صلواتیں سُننا اچھی بری کہنا اور ذرا دیر اس نیک بخت سے بات کرنا بھی تو لازم ہے۔ حقِّ زوجیت ادا نہ کریں گے تو ان کی مردانگی پہ حرف آئے گا۔ اسی لئے جو نازل ہوتا پہلے مرزا کی دکان پہ خود دودھ پیتا پھر ایک آب خورہ ہاتھ میں لیتا اور گرتا پڑتا بے دلی سے گھر کی راہ لیتا تھا۔ مرزا کے دودھ کو شادی شدہ لوگ توکشتہ کہتے تھے رکاوٹ کے لئے مومیائی کا کام دیتا تھا۔ بہتوں سے سُنا کہ مرزا دودھ میں پوست کی لاگ دیتے ہیں اور یہ کام ان کے لئے کچھ مشکل بھی نہ تھا۔ خود بھی افیم کے رسیا تھے اور دوسروں کو بھی موقع ملتے ہی اس کا چسکا لگا دیتے تھے۔

بات یہ ہے کہ دودھ والے تو وہ برائے نام تھے۔ چالیس برس پہلے جب انہوں نے یہ دکان کھولی تھی تب ہی بھٹّی کے نچلے حصّے میں ایک موکھا چھوڑ اس پر ولایتی ٹائل لگوا دیئے تھے اس موکھے میں افیم اور کوکین کی پتلی پتلی پڑیاں بندھی ہر وقت تیار رہتی تھیں اور جھٹ پٹے سے رات کے ڈیڑھ دو بجے تک ضرورت مندوں کو اس طرح سپلائی ہوتی تھیں کہ انجانے کو خبر ہونا تو درکنار شبہ ہونا بھی مشکل تھا۔ ہاں کبھی کبھی پولیس کے چھاپے پڑتے تو مرزا جھٹ ایک لات مار بھٹّی کے سامنے رکھا بجلی کا پنکھا پوری رفتار سے کھول دیتے تھے۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔ یہی وجہ ہے کہ انکی دُکان سے کبھی کچھ نکلا تو نہیں لیکن پولیس نے جھوٹے سچّے گواہ بنا کر شروع شروع دو چار مرتبہ مرزا کو تھانے میں بلایا تو مرزا نے چُپ چپاتے چوکی کے انچارج کا مہینہ مقرر کر دیا۔ ساری جاتی دیکھئے تو آدھی دیجئے بانٹ۔ پھر تو اُوپر سے بھی کبھی انکواری آئی تو علاقے کے ایس۔ ایچ۔ او نے بات کو رفع دفع کیا یا پھر اپنا آدمی بھیج کر پہلے تو مرزا کو اطلاع کرا دی اور پھر باقاعدہ چھاپہ مار کر اُنکی بے گناہی بالائی افسروں پر بھی ثابت کر دکھائی بھلا سانچ کو آنچ کہاں۔ مرزا یوں بڑے دیندار

آدمی تھے نہ اس کی کمائی کو اپنے تن پر لگاتے اور نہ گز بھر قطر میں پھیلی ہوئی توند کی بھٹی میں ڈالتے تھے۔ حرام کھا کے کیا عاقبت خراب کرنی تھی۔ کچھ پیسہ تو دکان کے سامنے سنگ مرمر کی سبیل بنوانے پر لگا دیا تھا جس میں دو تین بینچ ڈال دودھ پینے والوں کے بیٹھنے کا بھی انتظام کر دیا جاتا اور کچھ روڈ پر گانا سننے میں ٹھکانے لگا دیتے تھے۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ روڈ پہ مرزا کے نام کی کئی طوائفیں تھیں۔ رات گئے جب وہ دکان بند کر کے جاتے تو تھوڑی دیر گانا سن وہیں پڑ رہتے تھے۔ آگے پیچھے تو کوئی تھا نہیں جو انکی فکر ہوتی، جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناطہ۔ بس یہی ان کی زندگی تھی۔ کھا لیا، پہن لیا، جو باقی بچا وہ اُڑا لیا۔ اَب بھی انہیں اُونگھ آئی تو وہ دکان بڑھانے والے تھے مگر کڑھاؤ میں دودھ کچھ زیادہ تھا شاید ان کے گاہک آج سردی سے ٹھٹھر کے گھروں میں پڑے رہ گئے باسی دودھ بک تو جاتا تجر بھٹے کا ناشتہ کرنے والے سو ضرورت سے لے جاتے تھے مگر اصل بات یہ تھی کہ مرزا اتنی رات گئے تک جاگنے کے بعد سویرے سویرے دکان پر لوٹنے سے کترا رہے تھے۔ پھر آج جمعرات بھی تھی امینہ بائی خاص طور سے گھر میں اگر بتیاں جلا، کھوئے کے زردے پر سیدانی بی بی کی نیاز دلاتیں اور مرزا کا آدھی رات پیچھے انتظار کرتی تھیں۔ اس نیاز کا پورا خرچہ مرزا اُٹھاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مرزا دکان پر ذرا اکتا رہے تھے اور بے دلی سے پٹّا مارے بیٹھے تھے۔ کوئی اور دن ہوتا تو وہ لونڈے کو آواز دے دکان کا اَسبَاب بڑھواتے اور رکشہ میں نیم دراز ہو سیدھے روڈ کی راہ لیتے مگر وہ سارے دودھ کو نبٹا کے ہی جانا چاہتے تھے۔ نہ باسی بچے نہ کتّا کھائے۔ سردی کی وجہ سے انہیں بار بار جماہیاں آ رہی تھیں اور پھر ہلکی ہلکی اُونگھ نے آ دبایا۔ پھر جب وہ گھنٹی سے دودھ آب خورے میں ڈال رہے تھے تو یکایک ان کے کانوں میں چرخ چوں اور گھوڑے کے ساز کی آواز پڑی۔ وہ گاہک کو آب خورہ تھما آنکھیں بند کر کے آنے والی سواریوں کا تصوّر باندھنے لگے۔ مردوں کے ہونے کا سوال ہی نہیں وہ تو پیدل ہی جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ ہاں زنانی سواریاں ہوں گی۔ ذرا دیر کو آنکھیں تو کھل جائیں گی۔ آج گلی میں سوفتہ تھا۔ مغرب کے بعد سے اُچھا چہرہ ہی نہ دکھائی دیا تھا اس لئے مرزا کو

اور زیادہ بے چینی ہونے لگی۔ بس یہ تھی وہ بات جس نے انہیں ساکت ہو کے کنوتیاں کھڑی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُنہوں نے اس بدتمیز گاہک کو دل ہی دل میں موٹی موٹی گالیاں دیں جس نے ان کے تصوّر کا سلسلہ اپنے بھونڈے مذاق سے توڑ دیا تھا۔ پھر جب اُنہوں نے چند منٹ بعد تانگہ دکان کے سامنے کھڑا دیکھا تو اس طرح خفیف ہوئے جیسے یہ گالیاں اُنہوں نے گاہک کو نہیں آنے والی سواریوں کو دی ہوں۔ اور مٹر مٹر تکنے کی بجائے کنکھیوں سے تانگہ کی سواریوں کا جائزہ لینے لگے۔

ٹمٹماتے ہوئے دھوئیں سے کالے بلب کی روشنی، اس شدید سردی میں کچھ زیادہ ہی ٹھٹھر گئی تھی اور کہرے کی وجہ سے نگاہ دُور تک نہ جاتی تھی پھر بھی مرزا نے پٹ بیجنی جیاں جیسی آنکھوں کو بار بار کھولا اور بند کیا تو انہیں دو بُرقعے دکھائی دیئے ایک کالا انگریزی وضع کا اور دوسرا سفید لٹھے کا سیدھا برقعہ۔ مرزا کی آنکھیں اریب قریب کسی مرد کو تلاش کرنے لگیں مگر یہ دیکھ کر انہیں بڑی حیرانی ہوئی کہ دونوں مسماۃ اکیلی تھیں ساتھ دو چار گٹھریاں اور ایک پرانا سا چوبی صندوق بھی تھا۔ مرزا نے سوچا کوئی ادھیڑ عمر کی عورتیں ہونگیں اور شاید کسی دوسرے شہر سے آئی ہوں مگر جب وہ پاس سے گذریں تو سیاہ برقعے سے نکلتی نقرئی کرنوں نے مرزا کی باسی کھائی آنکھوں کو ایسا چکا چوندھ کیا کہ وہ باآواز بلند سُبحان اللہ بھی نہ کہہ سکے۔ محلے کے حسین چہروں کی تعریف وہ اسی طرح کیا کرتے تھے اور یہ وطیرہ بھی اُنہوں نے ابھی سال دو سال سے اختیار کیا تھا جب محلے کی بہو بیٹیوں پر سے ان کا اعتبار اُٹھ گیا تھا ورنہ وہ بڑے اصولی آدمی تھے جوانی سے بڑھاپے تک رنڈی بازی کی۔ یہ اُن کا اپنا فعل تھا البتہ پاس پڑوس کے لوگوں کو بُری نگاہ سے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ کہتے تھے ڈائن بھی سات گھر بَرے جا کے ڈستی ہے اور سانپ بھی اپنے بل میں سیدھا گھستا ہے۔

پھر دیکھتے دیکھتے زمانہ بدل گیا۔ مرزا کے سامنے کی ناک پونچھتی بچیاں سولہ سنگار کر کے ان کے آگے سے یوں گذرنے لگیں جیسے مرزا کے بڑھاپے پر طنز کرتی ہوں۔ دکان کے سامنے کوٹھے پر مولوی کرم الٰہی کی لونڈیا رہتی تھی اس نے ماشاءاللہ

خوب ہاتھ پاؤں نکالے اور ایسی ببرجوان ہوئی کہ دسیوں جوان مرزا کی دکان پہ کھڑے ہوئے مستقل اس کا نظارہ کرنے لگے۔ وہ بھی خوب جوبن دھار برآمدے میں لٹکے پنجرے کے طوطے کی دُم اس زور سے کھینچتی کہ وہ ٹیں ٹیں کا طوفان بپا کر دیتا تھا اور نیچے کھڑے جمِّ غفیر کی آنکھیں آسمان کو تکنے لگتی تھیں پھر ایک دن جب سامنے والی ڈیوڑھی میں چور چور کی آواز لگی تو مرزا اُٹھ سیدھے اندر گھس گئے اور اگلے ہی لمحے انہیں آنکھیں بند کئے باہر آنا پڑا۔ بس اس دن سے مرزا نے محلے والیوں کا احترام کرنا ہی چھوڑ دیا۔ چھنالیں، ٹکے ہائیاں، ایلے میلوں کو منہ لگاتی ہیں تو ہم کیا بُرے ہیں۔ کیوں نہ فیض اٹھائیں گھر کا مال گھر میں رہے تو اچھا ہے ورنہ سارے شہر میں اس محلّے کی تالی پھوپھو ہوگی۔ پھر ایک کرمِ اِلٰہی بے چاروں کی لونڈیا کا کیا ذکر اشتیاق پتنگ باز کی چھت پر دن دہاڑے سارے عالم نے وہ نظارہ دیکھا کہ جو سُنتا کانوں کو ہاتھ لگاتا تھا۔ لو کم بخت ماروں کو جگہ بھی یہی سُوجھی تھی۔ موئے آدمی نہ ہوئے کتے بلّے ہو گئے۔ پہلے تو سُنا ہے شیطان چادر تان کے بُرا کام کراتا پھر الم نشرح کرتا تھا اب ہاتھوں ہاتھ کرنے لگا ہے مرزا کی دکان پر محلے کا ہر آدمی روز نہیں تو ہفتہ عشرے میں ضرور آتا تھا مرزا نے صاف صاف تو نہیں ہاں کھُلے اِشاروں کنایوں میں کبھی کسی حرافہ کی شکایت بھی کی تو اس کے لوارے مرزا کے ایسے سر پڑے کہ انہیں اپنی چندیا کے چار بال بھی نُچتے نظر آئے۔ تب ہی انہوں نے ایک موٹی سی گالی ان کے جنتے جناتوں کو دی اور کہا کہ گھر سے شہ ملتی ہے جب ہی آدمی پکا چور بنتا ہے۔ بھلا چوروں کے محلّے میں ساہوکار بن کے رہنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ آس پاس برسے اور دِلّی پڑی ترسے۔ مرزا نے بھی اپنے سارے اصول تہہ کرکے ایک دن افیم کی پڑیوں کی طرح بھٹّی میں جھونک دیئے اور ایسے ننگ پن پر اُتر آئے کہ ہر آتی جاتی پر آواز کسنا اپنا شعار بنا لیا کچھ بڑبڑاتی ہوئی گذر جاتی تھیں اور کچھ کو مرزا نے آہستہ آہستہ ڈھرّے پر بھی لگا لیا تھا۔ کنواں جب پیاسے کے پاس آئے تو کنوئیں کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ سو مرزا نے روز روز بازار کے پھیرے چھوڑ کر گھر بیٹھے خاصے پھاگ کھیلنا شروع کر دیئے تھے۔

ہاں تو اس کالے برقعہ والی نے مرزا کے دل میں گدگدی پیدا کر دی تھی۔ رات کو تو بھلا تھاہی کون جو مرزا اس کی تھاہ لیتے مگر صبح ہوتے ہی اُنہوں نے یہ سن لیا کہ انوری بائی لکھنؤ سے

بازار چھوڑ یہاں کالی حویلی میں آن رہی ہیں اور اُنہوں نے کاروبار ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے۔ سو اس کا یقین تو کسی کو نہ آتا تھا۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا اور یقین کرنا بھی کون چاہتا تھا۔ محلّے کے عاشق مزاج تو اس طرح خوش نظر آئے تھے جیسے ان پر آسمان سے من سلویٰ اترا ہے۔ مرزا بھی الوری کا نام سن کر ذرا مطمئن ہو گئے لاکھ پیشہ چھوڑ دیا تھا مگر اَب ایسا بھی نہیں کہ چپ چپاتے مرزا کی رسائی بھی وہاں تک مشکل ہو جائے۔ آخر یہ بھی کھیلے کھائے تھے۔ ہزاروں گر کو ٹھے چڑھنے کے یاد تھے۔ بڑی بڑی نازک مزاجوں کی نتھیں اُتاری تھیں۔ دل گردے کے بھی بڑے تھے۔ پیسہ کمانا، اور پانی کی طرح بہانا ان سے زیادہ کسے آتا ہوگا۔ سوچا رنڈی کا دین دھرم پیسہ ہوتا ہے کبھی کو گھر آتا دیکھے گی تو بڑھ کے دروازہ کھولے گی۔ ذرا دو چار دن ٹک جانے دو۔ پھر ہم بھی دیکھ لیں گے۔ گرم گرم کھانے سے ٹھنڈی کر کے کھانا اچھا ہوتا ہے۔ ہاں اِتنا ضرور کیا کہ لونڈے کو بھیج صبح شام دودھ دہی کے لئے بھجوانا شروع کر دیا۔

الوری خالص ڈیرے دارنی تھی۔ ماں نے بڑی لمبی چوڑی جائداد ورثے میں چھوڑی تھی۔ اس جائداد کے بوتے پر اس نے رنڈی کے پیشہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنے کی دل میں ٹھان لی۔ یوں تو رنڈی پنے میں بھی وہ بڑی لئے دیئے رہتی تھی۔ کبھی اتار آدمی کو منہ نہ لگایا۔ بڑے بڑے رئیس دروازے پر آئے اور ٹھوکر کھا کے چلے گئے۔ دراصل وہ مزاج کی گرہستن تھی اور اسے بازاری پن سے نفرت تھی مگر وہ جو کہتے ہیں کہ آدمی کی خطا اللہ تو معاف کر دیتا ہے، آدمی نہیں کرتا، سو بیسیوں بار اس نے آنے جانے والے شریفوں کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن پکڑ نہ سکی داشتہ بنانے کو سب تیار تھے، کھاؤ، پیو، مزے کرو، مگر جب بیوی بنانے کا سوال اُٹھتا تو بدک جاتے تھے۔ ایک نہ حامی بھرتا کسی غریب غربا کے گھر جاتی تو ماں کو صدمہ ہوتا۔ زنانہ اولاد رنڈی کے گھر کا سرمایہ ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر یہ ہاتھ سے جائے تو اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے اور پھر الوری کی ماں تو مدّت سے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس لئے اس نے سوچا، ماں کو دُکھ دینے سے کیا فائدہ، اس کے پاؤں تلے تو جنّت ہے، مرے

پیچھے دیکھا جائیگا پھر ایک دن آخر ماں بے چاری مر گئی اور الوری نے کچھ جائداد اونے پونے بیچ کالی حویلی کا یہ مکان خریدا۔ کچھ گذر اوقات کے لئے کرائے پر کھڑی رہنے دی اور ایک دن آدھی رات گئے اسباب باندھ بازار چھوڑ یہاں آن بسی۔ ایک پرانی نوکر بے چاری خدا جانے ترس کھا کے یا کسی اور لالچ سے ساتھ چلی آئی۔ اکیل سے دوکیل ہوگئی اور سودا سلف لانے کا بھی ذرا آرام ہوگیا ورنہ یہ خود باہر نکلتی تو دیکھنے والے، اللہ معاف کرے، نظر ہی نظر میں ایسی عصمت دری کرتے کہ پارسائی کا بھوت ذرا دیر میں اُتر جاتا۔ خالص مسلمانی محلّہ تھا۔ اپنی بیوی سنبھلے نہ سنبھلے دوسری عورت پاس سے گذریں تو آنکھوں ہی آنکھوں سے گیا بھن کر دیں۔ گھر کی چار دیواری میں بھی الوری کوئی محفوظ تھوڑی تھی۔ خوب چوراہوں پر چرچے ہوئے۔ کسی نے کہا بوڑھا شیر حج کو چلا بن کے آیا ہے۔ کوئی بولا خوب نو سو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی۔ ہاں جنھیں رسائی کی تھوڑی بہت اُمید تھی وہ ضرور حمایت لیتے رہے۔ بظاہر خدا ترسی اور انسانیت تھی مگر دل ہی دل میں خوب منصوبے بنایا کئے۔ دو چار دن بھی نہ گذرے تھے کہ دروازے پر پیام و سلام آنے لگے۔ بڑی بی جو ساتھ رہتی تھیں، سنتے سنتے عاجز آگئیں تو باہر نکلنے سے کترانے لگیں۔ پھر دو چار مشاطاؤں نے آنا جانا شروع کر دیا۔ محلّے کے بیشمار سفید پوشوں کی اور بزرگوں کی قصیدہ خوانی کی۔ ان کی دولت اور عزّت کے ایسے افسانے سنائے کہ الوری ذرا ناسمجھ ہوتی تو چڑیا کی طرح دانا دیکھ پھر سے جال میں پھنس جاتی مگر وہ بھی تجربے کار بازار کی بیٹھنے والی تھی۔ سب کو چٹکیوں میں اُڑا دیا اور کسی ایسے کا انتظار کرنے لگی جو مرنے بھرنے والا ہو۔ دولت اور عیش و آرام تو سب کچھ دیکھ ہی چکی تھی اب تو فقط گھر کے لئے گھر والے کی ضرورت تھی کہ دنیا کی انگلیاں اٹھنی بند ہو جائیں۔ یوں کسی کے گھر پڑنا ہوتا تو اسے بھلا کیا کمی تھی۔ ماں کی زندگی میں ہی اچھے اچھے رئیس ڈیوڑھی پر ناک رگڑتے تھے اور کیوں نہ رگڑتے۔ صورت شکل کی ایسی تھی کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہزار دو ہزار میں بیٹھتی تو اکیلی نظر آتی تھی۔ خوب سفید سُرخی مائل رنگ تھا جیسے دودھ میں سیندور گھلا ہوا ہو اور چھب تختی ایسی کہ جو دیکھے بس دیکھتا ہی رہ جائے کتارا سی

کھڑی کھڑی ناک، لمبوتری کاغذی بادام جیسی آنکھ، پتلیاں ایسی کالی جیسی تاتاری ہرن کے نافے سے نکلی ہوئی مشک اور پلکیں چلمن کی چلمن، حیا کے بوجھ سے جھکی ہوئی، بھویں مسجد کی محرابیں، پیشانی روشن اور کشادہ، گال ایسے جیسے عنبری سیب، قد قامت بدن سب موزوں، سانچے میں ڈھلا، انسان کیا حور پری معلوم ہوتی تھی اسے چاہنے والوں کی کیا کمی تھی۔ مرد کا کیا ہے شکل دیکھی اور ریجھا مگر وہ بھی خوب جانتی تھی کہ رنڈی کا گھر دار بننا آسان نہیں ہے۔ جو آئے گا بھونرے کی طرح اسے چوس کر اڑ جائے گا۔ ایسے بیاہ سے تو کنواری رہنا بھلا۔ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ کوئی بھلا مانس ملا تو ٹھیک ہے ورنہ بہت بیت گئی کھوڑی رہی۔ یہ بھی یونہی بیت جائے گی۔ پدمنی عورت تھی۔ اول تو مرد کے سنگت کی خواہش ہی برائے نام ہوتی اور اگر ہوتی بھی تھی تو اس خواہش کا دبانا اس کے لئے مشکل کام نہ تھا۔ عورت اصول کی خاطر اپنی جان پر کھیل جاتی ہے اور انوری تو عورت بھی بس ایک ہی تھی۔ صبر سے بیٹھی سب کی سُنا کی۔

محلے کے عزت دار گھر والوں نے کچھ دن تو صبر کیا۔ سوچا آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں۔ آخر کب تک انکار کرے گی۔ سیدھی انگلیوں گھی نکلے تو ٹیڑھی کرنے سے کیا فائدہ لیکن جب ان کی امیدیں ٹوٹنے لگیں تو وہ اپنی سی کرنے پر اُتر آئے اور سازشیں بنانے لگے۔ کسی نے دو چار دستخط کرا ایک درخواست علاقے کی چوکی پر دے دی کہ شریفوں کے محلے میں بازاری عورت کا رہنا معیوب ہے اسے یہاں سے نکالا جائے۔ محلہ سدھار کمیٹیاں حرکت میں آگئیں۔ لوگ دروازے پر آ زور زور سے گالیاں دینے لگے دو چار عورتیں پیچھے لگا دیں کہ دن میں کئی کئی دفعہ جائیں اور ڈرا دھمکا کے دیکھیں کہ یوں بھی پسیجتی ہے یا نہیں مگر وہ اللہ کی بندی کسی طرح قابو میں نہ آئی۔ پھر جب محلے کے شریف لوگ بالکل مایوس ہو گئے تو باقاعدہ مہم چلائی گئی۔ پولیس کو روپیہ چٹایا گیا اور وہ اپنے آدمی بھیج کر گھڑی گھڑی ستانے لگی۔

مرزا دودھ والے خاموش ضرور تھے مگر حالات سے بے خبر تھوڑی تھے جب دیکھا پانی سر سے اونچا ہوا جاتا ہے۔ محلے کے شریف سب شرافت پر اُتر آئے تو انہوں نے

بھی خم ٹھونکے اور میدان میں کود پڑے۔ پولیس میں پہنچ تو ان کی دوسروں سے زیادہ تھی پہلے اثر رسوخ سے روکنا چاہا مگر جب دیکھا کہ پولیس پیسے کے علاوہ کسی کی سننے کو تیار نہیں تو انہوں نے بھی تھیلی کا موہنہ کھول دیا اور صاف صاف کہا کہ اب جس کی ماں نے زیادہ دودھ پلایا ہے وہ مقابلے پر آجائے۔ ہمارے آگے ناتھ نہ پیچھے نکیل ہاتھ پیر، روپیہ پیسہ کسی سے باہر نہیں جب تک دم میں دم ہے لڑیں گے۔ مگر یوں کسی کو حق ناحق ستایا جائے تو ہم سے نہیں دیکھا جاتا۔

مرزا نے لمبی چوڑی باتیں کیں تو سارے محلے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کچھ تو عزت بچا چپکے ہو کے بیٹھ رہے۔ کون ایسے ننگ کے منہ لگے اور کچھ پر ایسی ہوس سوار ہوئی تھی کہ وہ الوری کے ساتھ مرزا دودھ والے سے بھی دشمنی باندھ بیٹھے۔ اس دشمنی سے مرزا دودھ والے کو جہاں پیسے کا خاصا بڑا دھکا لگا وہاں اتنا ضرور ہے کہ الوری کا دل بھی انہوں نے جیت لیا اور ایک دن خادمہ سے بُلا راتوں رات الوری نے مرزا دودھ والے سے نکاح کر لیا۔

نکاح ہوئے پیچھے تو سارا محلّہ آپے سے باہر ہو گیا۔ الوری نے بھی تو غضب کیا تھا۔ اچھے بھلے رشتوں کو چھوڑ شادی کی بھی تو بڈھے بڑھیل، ٹوٹی کھپریل مرزا دودھ والے سے۔ بھلا محلے کے غیرت مند لوگ اسے کیسے برداشت کرتے۔ ہاں کوئی اُجڑی ریاست کا نواب پکڑتی تو صبر آجاتا مگر اب تو راتوں کی نیند حرام ہوئی جاتی تھی۔ ہائے کس کمینے نکھٹو آدمی کا ہاتھ پکڑا ہے قحبہ کہیں کی۔ فاحشہ نے بدمعاش ہی کو پسند کیا۔ سچ ہے نجاست کا کیڑا نجاست ہی میں خوش رہتا ہے۔ پھر یہ کہ اگر دونوں کہیں اپنا منہ کالا کر لیتے تو بھی صبر آجاتا۔ ذرا ٹھنڈک پڑ جاتی مگر یہاں تو ساری عمر چھاتی پہ مونگ دلوایئے اور حسد کی آگ میں جلتے رہیئے۔ اچھا خاصا ناسور تھا اس لئے محلے والے بھی اپنی سی کرنے پر مجبور تھے۔ پھر شیطان بھی انہیں رہ رہ کر اکساتا تھا۔ اسے تو فتنہ و فساد میں مزا آتا ہے۔ آخر اس نے ایسا فتنہ اُٹھایا کہ مرزا جیسے گھاگ بھی چاروں خانے چت گئے۔ پولیس نے پہلے تو دو چار مخبر پیچھے لگائے پھر پے در پے چھاپے مارے تو مرزا کو مجبور ہو کر افیم کا کاروبار بند کرنا پڑا اور یہ دھندا بند کرتے ہی وہ اُونگھا گئے اور دکان میں مکھیاں بھنکنے لگیں۔ سچ پوچھیئے تو ساری ریل پیل افیم کی برکت سے تھی

جب یہ نہ رہی تو دودھ کیا خاک بکتا۔ آخر ایک دن مرزا کو دکان میں تالا ڈالنا پڑا۔ پہلے تو جو کچھ پونجی پاس تھی بیٹھ کے کھائی مگر یہ کے دن چلتی۔ مرزا ہمیشہ کے شاہ خرچ تھے کبھی بچاکے تو رکھا نہ تھا بس کچھ اِدھر اُدھر اتفاق سے ہی گزارہ گیا ہوگا تو اس نے مہینے دو مہینے گذروادئے اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ الوری کی بقایا جائداد بکنے لگی۔ کھانے پینے کے لئے تو کرایہ ہی بہت تھا مگر مقدمے بازی کرنا تو دروازے پہ ہاتھی باندھنے کے برابر ہے کنوئیں کے کنوئیں شلق ہو جاتے ہیں دشمنی باندھنا کوئی آسان تھوڑی ہے محلے والوں نے ایک دوسرے کو گواہ بنا اتنے استغاثے دائر کئے کہ مرزا کی تمام عمر کھائی ہوئی افیم کا نشہ ہرن ہوگیا۔ الوری تھی تو عورت مگر کلیجہ مردوں کا پایا تھا۔ ایک دفعہ مرزا کو اپنالیا تو کیا مجال ہے کہ اس مصیبت کی گھڑی میں ذرا بھی اُپرائی ہو ڈٹ کر مقابلہ کرتی رہی اور جائداد پر جائدادیں یوں نیلام کیں جیسے مرزا دودھ والے لڑائی بھڑائی سے فارغ ہو کر انہیں دوبارہ خرید دیں گے۔ آدمی کیسا ہی جی دار ہو مگر ایک پر دو ہمیشہ بھاری پڑتے ہیں، مرزا کو بھی سارے محلے والوں نے مل کے اتنا ستایا کہ وہ محلہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ کالی حویلی والا مکان بھی آخر ایک دن کوڑیوں کے مول بک گیا۔ وہ تو یہ کہو کہ غیر محلے کے کسی آدمی نے خریدا ورنہ یاں والے تو چاہتے تھے کہ اس کا ایک پیسہ نہ ملے اور یونہی چھوڑ کے جانا پڑے۔

محلہ چھوڑ کے گئے تو مرزا کو بیسیوں جھگڑوں سے نجات ملی۔ البتہ وہ اس حالت کو پہنچ گئے تھے کہ روٹیوں کے لالے پڑنے لگے الوری کی جائداد دشمنی کی نذر ہو گئی اور انکے پاس تو رکھا ہی کیا تھا ڈھاک کے تین پات۔ کوئی ہنر ہاتھ میں ہوتا تو بھی خیر کما کھاتے مگر یہ کس کو پتہ تھا کہ ایک دن مرزا دودھ والے دکان چھوڑ محنت مزدوری بھی کریں گے۔ انکے ہاتھوں میں تو بس ایک ہی ہنر تھا۔ افیم کے انٹے کی گولیاں بنانا اور گولیوں کو نیاز کی شیرینی کی طرح سو دو سو آدمیوں میں تقسیم کر دینا۔ اس کے نذرانے پر گذر اوقات ہی نہیں اچھا خاصا عیش کرتے تھے۔ اس ہنر سے گئے تو بے چارے دین دنیا سے گئے۔ زندگی بھر رواں دواں پھرے اب گھر میسر آیا تھا تو روٹیوں کے محتاج ہو گئے اور روٹیاں تو جائیں بھاڑ میں دس پندرہ روپے روزانہ تو انہیں افیم کے لئے چاہیے تھے۔ دھڑلے کی کھاتے تھے گھر کی مرغی

دال برابر۔ اتنی نہ کھاتے تو سارا دن مکھیاں منہ کا محاصرہ کئے رہتیں اور رات کو الوری کی چارپائی سے دور الگ کھٹیا پر سونا پڑتا تھا۔

مرزا نے بہت دن تک تو اس جہنم کو برداشت کیا پھر ذرا اکتانے لگے۔ افیم کے متواتر نہ ملنے سے ان کا بڑھاپا بھی رنگ لایا۔ اچھا خاصا بدن سوکھ کے کانٹا ہو گیا اور مٹکا سی توند پچک کر کچری کے برابر رہ گئی۔ پھر رفتہ رفتہ طبیعت کی وہ غیرت بھی افیم نہ ملنے سے ستانے لگی جو ذرا پیٹ بھرے سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ کوئی خاندانی آدمی تو تھے نہیں مرزا بھی کسی دل جلے نے وضع قطع دیکھ کر لقب دیا تھا سو ان کو ایسا بھایا کہ اس کے پیچھے اپنا نام ہی بھلا بیٹھے۔ الوری کی آگ میں کودے تو ساری عمر کی عیاشی کا زعم تھا یہ معرکہ سر ہوا اور ذرا سوچنے کا موقع ملا تو اپنے آپ کو سینکڑوں گالیاں دیں ذرا سی بات کی خاطر بھرے گھر کو آگ لگا دی۔ ڈوبتے کو سہارا دیا اور خود بھی ڈوب گئے۔ عمر بھر کی ساتھی افیم چھوٹی اور روڈ کی بیسیوں رنڈیاں بھی جو ہر دم انکے انتظار میں آنکھیں بچھائے رہتی تھیں۔ پھر انہیں امینہ بائی کی یاد آئی۔ ہائے کیسی اچھی عورت تھی۔ الوری سے اچھی نہیں تو کچھ بری بھی نہیں تھی۔ بے چاری اب سیدانی بی بی کی نیاز دلاتی ہو گی تو خدا جانے خرچہ کون اٹھاتا ہو گا۔ غرض یہ کہ مرزا یوں پچھتانے لگے جیسے سانپ چھچھوندر کھا کے پچھتاتا ہے مگر سب کچھ اپنا کیا دھرا تھا اس لئے پچھتانے سے کیا حاصل ہوتا۔ بیٹھے بیٹھے روئیے اپنے ہی نین کھوئیے مرزا کو اچھا خاصا روگ لگ گیا تھا۔

الوری سے تعلقات بھی آہستہ آہستہ بگڑنے لگے۔ افیم کم ملنے سے مزاج تو چڑچڑا رہتا ہی تھا۔ بات بے بات اس سے الجھنے لگے۔ گالم گلوچ بغیر بات ہی نہ کرتے تھے کئی بار تو اسکے پھول جیسے بدن پر ڈنڈے بھی برسائے مگر وہ بڑی نیک عورت تھی، اف تک نہ کی سب کچھ برداشت کرتی رہی اور زبان سے شکایت کا ایک حرف نہ نکالا۔ خود دو دو دن فاقے سے رہتی تھی مگر انہیں تر نوالہ کھلاتی اور ان کے لئے افیم خریدنے کو بھی دس یا پانچ جو کچھ ہوتے ہاتھ پر رکھتی تھی برے تجھ سے ڈریئے تیرے آگے کچھ دھریئے۔ اسے دراصل اپنی عزت کا بڑا خیال تھا۔ مرزا کو چھوڑتی تو دنیا تھڑی تھڑی پکارتی اور اس کے لئے منہ دکھانے کو جگہ نہ رہتی۔ اس وجہ سے بے چاری سو طرح کے ظلم سہتی مگر کانوں کان کسی کو خبر نہ ہونے دیتی تھی۔

مرزا الوری سے بددل ہوئے تو پھر امینہ کے کوٹھے کی باری آئی اور ایک دن گھر سے نکل خراماں خراماں روڈ کی طرف ہو لئے۔ راستہ میں خیال بھی آیا کہ اب جانے سے کیا فائدہ پیسہ نہ کوڑی، مفت میں بے عزتی ہوگی مگر پھر پرانی آشنائی پر بھروسہ کرکے اللہ کا نام لیا اور کوٹھے پر چڑھ گئے۔ امینہ نے مرزا کو اچھا بھلا دیکھا تھا۔ اب جوان پہ نظر پڑی تو پہلے تو پہچان بھی نہ سکی پھر جب مرزا نے اپنی رام کہانی سنائی تو دیدے مٹکا مٹکا کے کچھ کچھ شناسائی کا اظہار کیا اور جب الوری کا نام آیا تو نہ جانے کیا سوچ مرزا کو ذرا پرچانے لگی۔ اس دن سے مرزا ہفتہ میں دو ایک مرتبہ گھڑی دو گھڑی کے لئے امینہ کے پاس جانے لگے امینہ خاطر مدارات بھی کرتی اور چلتے وقت دس پانچ روپے افیم کے لئے ان کے ہاتھ پہ رکھ دیتی تھی۔ الوری کو یوں تو مرزا کے امینہ کے ہاں جانے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ مرد ذات گھر کی عورت کے علاوہ باہر دو چار لگاہی رکھتے ہیں مگر بس اتنا سوچتی تھی کہ خدا نہ کرے کہیں اس کا بنا بنایا گھر نہ اُجڑ جائے۔ مرزا پہلے ہی غریبی سے پریشان تھے۔ مزاج بھی بگڑتا رہتا تھا۔ امینہ نے کچھ بُرا بھلا اس کے خلاف بھڑکا دیا تو غضب ہو جائیگا اسے تو ایک گھر کے علاوہ اب نگوڑا کوئی دوسرا گھر بھی نہ تھا۔

اور پھر الوری کا یہ خوف آگے آیا۔ امینہ نے مرزا کو پہلے تو کھلا پلا خوب شیشے میں اتارا۔ پھر ایک دن منہ کان کے قریب لا ایسا مشورہ دیا کہ مرزا سن کر تلملا گئے۔ دیر تک خون میں جھنجھناہٹ ہوتی رہی مگر جب ٹھنڈے دل سے غور کیا تو امینہ بائی کی بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ آدمی تو اس گنوت کے تھے ہی ذرا سی جھوٹی آن تھی سو وہ منٹ بھر کے طرارے کے بعد آپ ہی ختم ہوگئی۔ آخر انہوں نے سوچ لیا کہ وہ امینہ بائی کے ساتھ الوری کو دوبارہ بازار میں لا بٹھائیں گے۔ اب وہ گھر لوٹتے تو دیر تک الوری سے اُلجھتے رہتے تھے۔ خوب تیز م تازی ہونے لگی اور مرزا کھلے بندوں الوری کو چھوٹ چھٹاؤ کی دھمکی دیتے یا پھر ڈھکے چھپے الفاظ میں امینہ بائی کا مشورہ اس کے گوش گذار کرتے تھے۔ الوری نہ پٹنے سے گھبراتی تھی اور نہ گالیاں سُننے سے مگر ہاں اس نے جس زندگی کو چھوڑ دیا تھا اس کی طرف وہ بھول کے بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ جان جائے یا رہے مگر یہ نہیں ہوگا کہ

انوری پھر سے انوری بائی کہلانے لگے اور بازار میں بیٹھ کر اپنا تھوکا ہوا چاٹنے لگے۔ اِدھر مرزا کو امینہ روز اکساتی اور سبز باغ دکھاتی تھی پھر وہ خود بھی لالچ کے مارے تھے اسی لئے اُنہوں نے انوری سے زیادتیاں کرنی شروع کیں۔

ایک دن اُنہوں نے پہلے تو انوری کو خوب مارا پیٹا پھر چٹیا پکڑ گھر سے نکالنے پر آمادہ ہو گئے۔ "فاحشہ کہیں کی، ستی ساوتری بنتی ہے" مرزا نے ایسا طعنہ دیا جو انوری سے اُٹھائے نہ اُٹھا انوری اب تک جو ہوا سب کچھ سہہ گئی تھی مگر یہ گالی اس کے دل میں چبھ گئی اور اگلے دن مرزا کی جیب سے افیم کا انٹا نکال اس نے کڑوے تیل کے ساتھ کھا لیا۔

انوری فاحشہ تو اسی دن قبر میں جا سوئی مگر مرزا شریف زادے مدت تک روڈ پر امینہ بائی کے ساتھ سونے والوں کا انتظار کرتے رہے۔

بھابھی

بھابی سے پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے ان کی آنکھوں میں تپتے ہوئے ریگ زار دیکھ لیئے۔ وہ دوپہر کے سورج کی مانند تھیں۔ خوب گرم جھلسا دینے والی اور مائل بہ زوال۔ ان کا جسم ہستنی عورت جیسا گدرایا ہوا قد بُوٹا سا اور ہاتھ پاؤں جسم کی مناسبت سے ذرا چھوٹے تھے میری نگاہ کچھ دیر ان کی نگاہ سے الجھی تو اُنہوں نے گھبرا کے پلکوں کی چلمن چھوڑ دی اور انکا چہرہ شفق آلود مطلع کی طرح خوب تمتما گیا۔

بھابھی گجرات سے بیاہ کے بمبئی آئی تھیں۔ پھر کچھ دن بعد انکے شوہر دہلی منتقل ہو گئے۔ ان کی شادی کو خاصا لمبا عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک لاولد تھیں مگر انہیں دیکھ کر ہرگز یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ ان میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ وہ بانجھ عورت کی طرح بت جھڑ کا درخت نہیں برساتی بیل کی مانند ہری بھری تھیں۔ انکے جسم کی ساخت غیر معمولی کشش، کولہوں کی گدگداہٹ اور سینے کی فربھی سب انکی زرخیزی کا واضح ثبوت تھے۔ انہیں بھی شاید اس کا احساس تھا۔ اس لئے جب میں نے ان کی خالی گود کو شک بھری نگاہ سے دیکھا تو اُنہوں نے چھوئی موئی کی طرح اپنے آپ کو سمیٹ لیا اور ان کا تھرکتا ہوا جسم یکبارگی مردہ گوشت کی مانند ٹھنڈا ہو گیا۔

گجراتی عورتیں پہاڑی گائے کی طرح معصوم ہوتی ہیں۔ ان کے زعفرانی چہروں پر گذرتے ہوئے برسوں کے نشانات بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ میں بھابھی کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں کر سکا

لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ ان کی شادی کو اٹھارہ سال بیت گئے ہیں تو میں نے سمجھ لیا کہ وہ کم سے کم چالیس کی ضرور ہونگی۔ عورت چھوٹی کاٹھی کی ہو تو لمبے عرصہ تک جوان

رہتی ہے ۔ بھابھی مجھے اپنی عمر سے زیادہ ہی جوان نظر آئیں ۔ وہ شریر بچوں کی طرح چنچل تھیں اور ان کا جسم پارے کی طرح متحرک تھا ۔

گرمیوں کی ایک خوش گوار شام تھی ۔ میں فریدہ کے یہاں چھوٹے سے لان میں آرام کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا ۔ اندر صحن میں کسی نے اس کے بھتیجے کو چھیڑا تو وہ جھنجھلا کر چیخنے لگا ۔ پھر اس کے ننھے ننھے قدموں سے بھاگنے کی آواز آئی اور اس کے پیچھے کوئی اور بھاگتا ہوا لان سے متصل ڈرائنگ رُوم میں آگیا ۔ میری نگاہ سوالیہ نشان بن کر فریدہ کی طرف اُٹھی تو اس نے کہا "یہ بھابھی ہیں" اور اگلے ہی لمحے سُرخ اسپورٹ شرٹ اور نیلی جینز پہنے ہوئے بھابھی لان میں آگئیں ۔ اُنہوں نے مجھے دیکھ کر اس طرح سلام کیا جیسے وہاں میری موجودگی نے انہیں یکایک چونکا دیا ہو ۔ میں نے سلام کا جواب دیا اور ان سے بیٹھنے کو کہا تو وہ فریدہ کی کرسی کے بازو پر ٹک گئیں ۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنی شوخیوں سے کسی محرومی پر بناوٹی آسودگی کا پردہ ڈال رہی ہیں ۔ بھابھی کی آنکھوں سے تشنگی کے سوتے پھوٹ رہے تھے اور وہ قلانچیں بھرنے کے باوجود زخمی ہرنی کی طرح اُداس دکھائی دیتی تھیں ۔

فریدہ ایک خاموش اور متاثر کرنے والی لڑکی ہے ۔ وہ زندگی کی اٹھائیسویں منزل تنہائیوں کے ساتھ گذار رہی ہے ۔ اس کی سنجیدگی مجھے اس زمانے میں بھی پسند تھی جب وہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی اور اب بھی گاہے گاہے اس کے ٹھہرے ہوئے جسم اور چہرے کے سکوت کو دیکھنے کے لئے میں اس کے گھر جاتا ہوں ۔ اس کا رنگ آبنوس کی طرح سیاہ اور ایسا چمکیلا ہے جیسے ہمالہ کی ترائی میں رہنے والے مُشکی ہرن کا ہوتا ہے ۔ مجھے اس رنگ سے وفاداری اور جاں نثاری کی بو آتی ہے ۔ ہلکے رنگوں کا لباس چاندنی رات کی طرح اس کے سلونے جسم پہ نقرئی کرنیں بکھیر دیتا ہے ، وہ بھینی بھینی خوشبو میں ہر دم ڈوبی رہتی ہے اور اس کے پاس بیٹھ کر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے شام کے دھندلکے حسین خواب بن کر ذہن پر ہلکے ہلکے چھا رہے ہوں ۔ فریدہ کا جسم نازک ، متناسب اور قد سرو کی طرح لانبا ہے وہ بہت کم بولتی ہے لیکن جب بولتی ہے تو اِس کی آواز ممتا بھری لوریوں کی طرح کانوں کو ایک ٹھنڈی آسودگی بخشتی ہے ۔ اس روز جب میں نے بھابھی کو پہلی مرتبہ دیکھا تو فریدہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی اور میں کرسی کی پشت سے سر لگائے

غالباً اونگھنے لگا تھا کہ بھابھی کے فلک شگاف قہقہوں نے میرے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بھابھی فریدہ کی ضد تھیں۔ ان کی آواز مغربی موسیقی کی طرح جگر کے پار ہوتی تھی اور بدن کی آنچ سے آدمی خود کو پگھلتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ میں فطرتاً تعیش پسند واقع ہوا ہوں۔ عورت کی رُوح سے زیادہ اس کے جسم کو ٹٹولتا ہوں۔ بھابھی کی تُند و تیز شخصیت کے دھارے میں فریدہ کا وجود تنکے کی طرح بہہ گیا اور میری بھوکی نگاہ سٹپٹا سٹپٹا کے ان کے جسم کی گولائیوں پر پھسلنے لگی۔ ہم لوگ اُٹھ کر ڈرائنگ رُوم میں آگئے اور وہاں کی تیز ہوتی روشنی نے مجھے بھابھی اور فریدہ دونوں کے آگے ننگا کر دیا۔ پھر فریدہ کافی لینے اندر چلی گئی تو میں بھابھی سے اُکھڑے اُکھڑے سانس کے ساتھ اُوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگا۔ بھابھی مجھے غائبانہ طور پر جانتی تھیں۔ ان سے فریدہ نے میرا ذکر کیا تھا۔ فریدہ میری کمزوریوں سے واقف تھی اور بھابھی بھی شاید فریدہ کی معرفت یا اس ملاقات کے بعد انہیں جان گئی تھیں۔ عورت مرد کو پہچاننے کے معاملے میں بڑی حساس ہوتی ہے۔ جب کہ مرد عورت کے بارے میں اکثر غلط رائے قائم کرتا ہے۔

آٹھ سال پہلے میں اور فریدہ کالج میں پڑھتے تھے۔ ہماری کلاس میں آٹھ دس لڑکیاں تھیں۔ میں سب سے خوب باتیں کرتا تھا مگر فریدہ کے آگے میری زبان گنگ ہو جاتی تھی۔ آخر سجاتا نے میری مدد کی اور ہم دونوں تنہائی میں ملنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا کہ فریدہ مجھے چاہتی ہے میں بھی اس کے قرب سے ایک خاص تسکین پانے لگا۔ ہم دونوں کبھی کبھی باہر گھومنے بھی جاتے تھے مگر اس باہمی رفاقت کا فریدہ نے زبان سے اقرار نہیں کیا۔ مجھے اس کی خاموشی بُری لگتی تھی۔ میں نے اسے کئی بار مجبور کیا کہ وہ مجھ سے قول و قرار کرے جھوٹی سچی تسلیاں دے، میری حوصلہ افزائی کرے اور سنجیدگی کی وقیع بلندیوں سے تھوڑی دیر کے لئے غیر سنجیدہ پستیوں میں اُتر آئے۔ فریدہ نے ایسا نہیں کیا۔ وہ کہتی تھی زندگی کے لطیف جذبے لفظوں کی کثافت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ احساس کے آبگینے آواز کی لہروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ مجھے فلسفہ سے اب بھی کوئی دلچسپی نہیں اور ان دنوں تو میں زندگی کے ایسے دور سے گذر رہا تھا جہاں سفلگی بجائے خود ایک فلسفہ ہوتا ہے۔ مجھے فریدہ کی باتیں اچھی لگتی تھیں میری رُوح ان باتوں کی لطافت سے بھرپور حظ اٹھاتی تھی مگر میرے لئے محض رُوح کی شادمانی کافی نہیں تھی اس لئے میں نے فریدہ سے

شادی کا ارادہ ترک کر کے ایک سیدھی سادھی کم فہم، کم سخن عورت سے شادی کر لی۔

گجراتی عورتیں میں نے پہلی مرتبہ اجمیر میں دیکھی تھیں۔ حد درجہ معصوم۔ اپنی رعنائیوں سے بے خبر۔ ڈھیلے ڈھالے کرتے اور ایک بڑے پاجامے میں ملفوف یہ عورتیں وہاں اس طرح گھومتی پھرتی دکھائی دیتی تھیں جیسے انہیں زندگی کی کثافتیں چھو کر بھی نہیں گزری ہوں ان عورتوں کو غیر مرد کا رجھانا اور اسے اپنی طرف مائل کرنا بالکل نہ آتا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے اپنے مرد ہوتے تھے۔ شوہر، بھائی، باپ نگران کے سپاٹ چہروں اور تاثر کی کمی کے باعث ساتھ والے مرد کے رشتہ کا اندازہ لگانا بڑا مشکل کام تھا۔ عورت جنس کو افزائش نسل کا ذریعہ سمجھ لے تو اس میں طوائف پن نہیں پیدا ہوتا اور جتنا جنس کی لذّت سے آشنا ہوتی جاتی ہے اتنی ہی وہ عورت پن سے گرتی جاتی ہے۔ میلے میں آنے والے مرد۔ بوڑھے اور جوان عادت کے مطابق ان گجراتی عورتوں کو گھورتے اور اپنی نگاہ کی داد نہ پاتے تو بڑی بے دردی سے دھکّا مُکّی کرنے لگتے تھے۔ وہاں حیدر آبادی عورت نظر بازی کے لئے مشہور تھی۔ دلّی والیوں کیلئے کہا جاتا تھا کہ وہ پٹ دکھا کے مارتی ہیں۔ بمبئی کی عورت لاٹری کا ٹکٹ سمجھی جاتی تھی اور گاؤں گویں سے آنے والی الھڑ عورتوں کے جسم یہاں پوشیدہ خزانوں کی طرح ٹٹولے جاتے تھے۔ ان کے لمس کی شیرینی کا بیان جب یار باشوں کی محفل میں ہوتا تو لوگ ہونٹ چاٹنے لگتے تھے۔ گجراتی عورت اس میلے میں شب خون کی جان سمجھی جاتی تھی۔

میلے میں ان گنت مخلوق دُور دُور سے آتی ہے۔ گلی محلّے سڑکیں اور حویلیاں سب عورت مرد سے پٹی ہوتی ہیں۔ دن بھر کے تھکے ہوئے لوگ رات کو یوں پاس پاس سو جاتے ہیں جیسے ایک ہی گھر کے افراد ہوں۔ پھر رات بھر تھکن اُترتی ہے۔ گھڑے پھوٹتے ہیں جست کے صندوقوں میں رکھے برتن کھنکتے ہیں۔ چوڑیاں اور پازیب بولتے ہیں، چور چور کی آوازیں لگتی ہیں اور کم عمر ناپختہ کار لڑکیاں رات بھر میں کئی بار "اُوئی ماں" کہتے ہوئے چونک پڑتی ہیں۔

بھابھی سے ملا تو مجھے اس میلے کے شب خون یاد آنے لگے۔ سردیوں کا موسم تھا میں اور میرے خالہ زاد بھائی تنویر ایک بڑی حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس حویلی کا

دروازہ کسی بڑے دالان کی طرح کشادہ تھا۔ کچھ لوگ جن کے لئے ہوٹل اور پرائیویٹ مکان کا خرچ اُٹھانا مشکل کام تھا وہ حویلی کی ڈیوڑھی میں ٹھہر گئے تھے۔ ایک عورت مہاراشٹر کی تھی اس کے ساتھ اس کی بوڑھی ساس اور ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ وہ ساڑھی کو ٹانگوں کے بیچ سے نکال کر دھوتی کی طرح کمر پر اُڑستی تھی جس سے اس کے کولہوں کا اُبھار اور زیادہ واضح ہوجاتا تھا۔ سانولا رنگ اور اوسط درجے کا ناک نقشہ تھا عمر بھی خاصی زیادہ تھی مگر اس عمر میں بھی اس کی جسمانی کشش کم نہیں ہوئی تھی۔ تنویر اس عورت پر ریجھ گئے اور رات کو میلے سے لوٹتے وقت انہوں نے خدا جانے کیا حرکت کی کہ عورت کی گھگھی بندھ گئی۔ اچھّا خاصا ہنگامہ ہوا اور صبح وہ خاندان کسی دوسری جگہ منتقل ہوگیا۔ پھر ڈیوڑھی میں ایک گجراتی گھرانا آیا۔ اس میں ایک لڑکی بھی تھی۔ دبلی پتلی، نازک اندام، چمکدار اور معصوم آنکھوں والی۔ ہم نے اسی پر ایک مخصوص نگاہ ڈالی مگر جواب نہیں ملا وہ نظر بازی کے فن سے ناواقف تھی۔ اس رات ہم دو بجے لوٹے تھے۔ میں تھک کر چور ہوگیا تھا۔ نیند کا کچّا ہوں اس لئے آتے ہی سوگیا۔ کچھ دیر بعد آنکھ کھُلی تو میں نے چاہا کہ اُٹھ کر لباس تبدیل کرلوں۔ کمرے میں پازیب کی ہلکی جھنکار گونج رہی تھی اور میرے قریب دوسری مسہری پر تنویر ڈیوڑھی والی گجراتی لڑکی سے اُلجھے ہوئے تھے۔ دونوں اس طرح ساتھ لیٹے تھے جیسے انکی برسوں کی شناسائی ہو۔ صبح معلوم ہوا کہ وہ ہاتھ پکڑتے ہی تنویر کے ساتھ یوں چلی آئی تھی جیسے میلہ گھومنے جارہی ہو اور یہاں سے اس طرح واپس گئی تھی جیسے کسی کے بستر سے نہیں مندر سے واپس گئی ہو۔ کنوارپن ذرا مجروح نہیں ہوا تھا اور رات کی تفصیلات کا صبح اسکے چہرے سے اندازہ کرنا خود میرے لئے مشکل ہوگیا تھا۔

فریدہ کافی لے کر واپس آئی تو اس نے مجھے بھابھی سے باقاعدہ متعارف کرایا۔ بڑی زندہ دِل عورت ہیں، خوب چنچل اور ہنسوڑ بس ہر دم ہنساتی رہتی ہیں۔ ہمارے برابر والا مکان انہیں کا ہے ویسے یہ رات دن ہمارے یہاں ہی رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کا بہت بڑا کاروبار ہے وہ عام طور سے دورے پر رہتے ہیں۔ پیسہ کی کوئی کمی نہیں ہے۔ بھابھی بڑی رئیس ہیں۔ فریدہ کہنے لگی آپ کے بھائی صاحب دورے پر سے آئیں گے تو آپ کو اُن سے بھی ملاؤں گی

بھابھی کا رنگ اس آخری جملے پر کچھ متغیر سا ہو گیا لیکن اس تبدیلی کو انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنی دانست میں میری متلاشی نگاہوں سے چھپا لیا۔

میں، بھابھی، فریدہ اور اس کی دو چار سہیلیاں مل کر ایک دن سیر کو گئے۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ کنوار کا مینہ برسنے سے موسم میں ہلکی سی خنکی آ چلی تھی۔ دھوپ کی تمازت پچھلے چھ مہینے اپنا زور دکھا کر دم توڑنے لگی تھی۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور صاف نیلے آسمان پر ہوا میں چیلیں رقص کرتی پھر رہی تھیں۔ بھابھی نے اس دن ہلکے فیروزی پھولوں والی مردانہ بوشرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اچھلتی کودتی اپنے برآمدے سے نکلیں تو انہوں نے میرا پُرزور استقبال کیا اور ہاتھ پکڑ کر اپنی مرسڈیز گاڑی میں بٹھا لیا۔ فریدہ کی ایک دو سہیلیاں بھی ان کی کار میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ ہم لوگ فرید آباد کی طرف بڑھنے لگے۔ بھابھی خود ہی ڈرائیو کر رہی تھیں۔ انہوں نے سڑک پر بے تکان گاڑی دوڑانا شروع کر دی۔ فریدہ کی ایمبیسیڈر پیچھے غبار میں کچھ دیر تو دکھائی دی پھر نہ جانے کہاں گم ہو گئی۔ راستہ میں کئی خطرناک موڑ آئے بھابھی نے رفتار کم کئے بغیر گاڑی موڑی تو وہ اسٹرینگ کے ساتھ خود بھی مجھ پر جھک گئیں پھر چکنی چکنی سڑک سے ہلکی ہلکی سسکاریوں کی آوازیں آنے لگیں اور میری آنکھیں اس قرب کے نشے سے گلابی ہو گئیں۔ میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا تو بھابھی نے مجھ سے سگریٹ کی فرمائش کی اور اپنے ہونٹوں کا شگوفہ میرے منہ کے آگے کھلا دیا۔ وہ سگریٹ لونڈوں کی طرح سگریٹ پی رہی تھیں اور ان کے منہ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے غبار میگھ دوت کی طرح فضا میں کچھ مبہم سے پیغام بکھیر رہے تھے۔

ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے کہا مجھے خطرات سے کھیلنا پسند ہے جی چاہتا ہے آج کوئی حادثہ پیش آئے اور ہم سب پلاسٹک کی گڑیوں کی طرح گاڑی میں پچک کے رہ جائیں۔ پچھلی سیٹ سے "ہائے اللہ" کا نعرہ بلند ہوا۔ بھابھی نے دیوانگی کے عالم میں رفتار اور زیادہ تیز کر دی۔ بھابھی کہنے لگیں مجھے ٹمٹماتے ہوئے چراغ پسند نہیں۔ زندگی میں دو پلنج ہونا چاہیئے۔ اب وہ میرے بالکل قریب آ گئی تھیں اور میں ان کے جسم سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو محسوس کر رہا تھا۔ اس خوشبو سے میری حسیات کو وہ ذائقہ ملا کہ میں ان کے شانے پر سر رکھ کر اونگھنے لگا۔ خوشبو کے معاملے میں میں بڑا ذکی الحس واقع ہوا

ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ بھابھی کے جسم سے اکتوبر کے مہینے میں جون کی خوشبو آ رہی تھی۔
گاڑی سورج کنڈ کے پاس سے گذر رہی تھی۔ بھابھی نے مشورہ دیا کہ ہم لوگ یہاں ذرا دیر کو دم لیں گے۔ یہاں ایک خوب صورت ریستوران ہے وہاں ٹھنڈے یخ کوکا کولا پئیں گے اور اتنے میں فریدہ کی پارٹی بھی ہم سے آن ملے گی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی دونوں لڑکیوں نے آمادگی کا اظہار کیا۔ گاڑی رُک گئی۔ ریستوران کے آگے جھیل کے کنارے لان پر کرسیاں پڑی تھیں ہم سب وہاں بیٹھ گئے اور کوکا کولا پینے لگے۔ بھابھی کی مرسڈیز کچھ فاصلے پر سڑک کے قریب خاموشی سے کھڑی فریدہ کا انتظار کر رہی تھی اور بھابھی کی طرح آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بھابھی جاڑوں کی دُھوپ کی طرح چمکدار اور روشن تو دکھائی دیتی تھیں مگر ان میں پسینہ لانے والی تمازت نہیں رہی تھی۔
فرید آباد میں ہم نے بقیہ دن گذارا ادھر اُدھر پتھریلے راستوں پر بھٹکتے رہے۔ شام کے جھٹ پٹے میں آنکھ مچولی کھیلی۔ بھابھی چور بنیں تو انہوں نے خاص طور سے مجھے تلاش کر کے پکڑنے کے بہانے پورے زور سے بھینچ لیا اور ان کے گداز جسم کے بھرپور لمس نے مجھے نہ جانے کتنی بار چور بننے پر مجبور کر دیا۔
ہلکی سردیاں شروع ہو گئی تھیں، میں فریدہ کی طرح بھابھی کے گھر بھی جانے لگا تھا۔ بھابھی عام طور سے گھر میں اکیلی ہوتی تھیں۔ یا پھر فریدہ ان کے گھر آئی بیٹھی ہوتی تھی ہم تینوں دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ فریدہ عادت کے مطابق زیادہ تر خاموش ہی رہتی تھی اور بھابھی مجھ سے ہنسی مذاق کیا کرتی تھیں۔ رمی اور کیرم کھیلتے وقت وہ اتنی بے تکلف ہو جاتی تھیں کہ انہیں فریدہ کی موجودگی کا بھی خیال نہیں رہتا تھا کچھ دن بعد میری موجودگی کے دوران فریدہ نے بھابھی کے ہاں آنا بند کر دیا۔ وہ بڑی سمجھ دار لڑکی تھی اور اس کی یہی سمجھداری مجھے گراں گذرتی تھی۔ عورت کو حاسد ضرور ہونا چاہیئے اس سے مرد بڑا آسودہ رہتا ہے۔
بھابھی میرے اور قریب آ گئیں تو اُنہوں نے ہر شام میرا انتظار کرنا شروع کر دیا۔
ہم دونوں اکثر گھر ہی میں بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی کبھی بھابھی اپنی گاڑی نکالتیں اور اندھیری سڑکوں پر شائیں شوں ڈرائیو کرنے نکل جاتی تھیں۔ میں ان کے پہلو میں بیٹھا ان کے چہرے کے اُتار

چڑھاؤ جسم کی حرکتوں اور جذبات کی موجوں کا خاموش مطالعہ کرتا تھا۔ کچھ دنوں بعد یہ حرکتیں اور جذباتی تلاطم میرے لئے اجنبی نہیں رہے تاہم یہ احساس میں کبھی فراموش نہ کر سکا کہ بھابھی ایک خوب صورت اداکارہیں۔ ان کا آسودہ چہرہ ایک نقاب کی مانند ہے جس کے پیچھے انہوں نے نہ جانے کتنی محرومیاں چھپا رکھی ہیں، بھابھی مجھے ازلی پیاسی دکھائی دیتی تھیں سراب کی مانند ان کی رگ رگ سے تپیتے تپیتے اچٹنے کی آواز آنے لگی تھی۔ میرا تجسّس بڑھتا گیا۔ اور میں بھابھی کی زندگی میں اس ناآسودگی کا جواز تلاش کرنے لگا۔

فریدہ نے بتایا کہ بھابھی کے شوہر بڑے وجیہہ اور خوبرو انسان ہیں ان کے قُرب کو غالباً ہر عورت اپنے لئے خوش قسمتی تصوّر کرے گی۔ وہ بڑے شوقین مزاج آدمی ہیں جب گھر پر ہوتے ہیں تو بھابھی کو ہردم ساتھ لئے پھرتے ہیں اور بھابھی ان کے پاس بیٹھی خوشی سے پھولی نہیں سماتیں۔ فریدہ کہتی تھی کہ بھائی صاحب نے بھابھی سے اپنی پسند کی شادی کی ہے۔ یہ دونوں کسی تقریب میں پہلی بار ملے تھے پھر ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے اور رفتہ رفتہ نوبت شادی تک جا پہنچی۔ بھابھی اب تک اپنے شوہر پر جان چھڑکتی ہیں۔ انکی شادی کو تقریباً بیس برس گذر گئے۔ اس دوران وہ دو بار اُمید سے ہوئیں مگر پورے دنوں بچے کو پیٹ میں ٹھہرنے نہیں دیتی تھیں اس لئے وہ چند سانس لے کر مرگئے۔ بھابھی بچہ پیدا کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ انہیں بچّوں سے نفرت ہے۔ وہ کہتی ہیں بچے شوہر اور بیوی کے درمیان دیوار کھڑی کر دیتے ہیں، فریدہ کے سامنے بھابھی کے ہاں ایک بچہ ہوا تھا اور فریدہ نے بتایا کہ بھابھی اس بچے کی پیدائش پر خلافِ توقع مطمئن دکھائی دیتی تھیں۔ لیکن وہ بھی کچھ ہی دن جی کر مرگیا اور بھابھی پہلے ہراسان اور پھر خوش دکھائی دینے لگیں۔ بھابھی کے متعلق میرے اندازے غلط ثابت ہوئے تو میں نے شرمندگی کے تحت بھابھی کے ہاں جانا کم کر دیا اور مجھے تعجب ہوا کہ جب بھابھی نے اس بے التفاتی پر مجھ سے ذرا بھی شکایت نہیں کی۔

ایک دن میں کافی عرصے بعد بھابھی کے ہاں گیا۔ گھر میں آج وہ اکیلی نہیں تھیں۔ ان کے شوہر بھی موجود تھے۔ وہ کسی بزنس ٹور سے چار مہینے بعد واپس آئے تھے۔ فریدہ کے کہنے کے مطابق بھابھی کے شوہر خوش شکل، خوش لباس اور خوش اطوار آدمی

تھے ۔ ان کا رنگ سفید تھا اور اسمیں سے سُرخی جھلکتی تھی ۔ جسم توانا اور صحت مند دکھائی دیتا تھا آنکھیں غیر معمولی طور پر سیاہ اور چمکدار تھیں ۔ ان کے گرد گھنی پلکوں کا جال تھا ۔ وہ بیرونی ملک سے لائے ہوئے سگریٹ کا پیکٹ ہاتھ میں لئے میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھے تھے انہیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ بھابھی کے متعلق میرے تمام شکوک یکسر غلط تھے یا پھر گذشتہ قیاسات میری ہی کسی نفسیاتی اُلجھن کا پتہ دیتے ہوں گے ۔ مجھے ان کے شوہر سے مل کر خوشی کے بجائے صدمہ ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ بھابھی سے تعلقات برقرار رکھنا اب میرے لئے ناممکن ہو جائے گا ۔ مجھے ان کے شوہر کی بھاری بھرکم شخصیت نے مرعوب کر دیا تھا ۔ بھابھی اس مرعوبیت کو بھانپ گئیں اور ان کے چہرے پر آگہی کے بڑے گہرے نقوش دکھائی دینے لگے ۔ وہ ایک خاص فاتحانہ انداز میں میرے شکست خوردہ ذہن پر طنز کرتی رہیں ۔ میرے لئے ذرا دیر کو وہاں بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا اور میں نے خرابیٔ طبیعت کا بہانہ کر کے اجازت لینی چاہی ۔ ان کے شوہر نے سگریٹ کا پیکٹ ہاتھ سے رکھ کر مصافحہ کیا تو میں نے دیکھا کہ ان کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ، مینڈک کی طرح گلگلا اور اسفنج کی طرح نرم تھا ۔ مجھے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر بڑی مسرّت ہوئی اور میرا رواں رواں "پالیا پالیا" کی صدائیں دینے لگا ۔ بھابھی نے بھی میری اس مسرّت کے احساس کو اپنی تیکھی نظروں سے بھانپ لیا اور جواب میں میری طرف نفرت اور حقارت کی ایسی بھرپُور نظر ڈالی کہ میں نے آئندہ ان سے نہ ملنے کا فیصلہ کرتے ہوئے رُخصت لے لی ۔

بھابھی اس واقعہ کے بعد فریدہ کے ہاں کئی بار ملیں مگر انہوں نے مجھے پہچاننے کی کوشش نہیں کی اور فریدہ اپنی بے نیازانہ طبیعت کے ساتھ ہمیشہ یہ ظاہر کرتی رہی کہ اسے میرے اور بھابھی کے نجی تعلقات کا علم ہی نہیں ہے ۔

ستوانسا شہزادہ

میر محمد علی کی بیوی کا پاؤں بھاری ہوا تو آدھے شہر میں دھوم مچ گئی۔ بُوڑھے منہ مہاسا، لوگ کریں تماشا۔ جو سُنتا، دانتوں میں اُنگلیاں دیتا تھا اور سچ پوچھیے تو وہ خود بھی حیران تھیں۔ پہاڑ سی جوانی کم بخت مرادیں مانتے مانتے گذر گئی، چڑیا کا بچہ پیدا نہ ہوا، اب بڑھاپا آیا، آدھا جونڈا اسفید ہوا تو یہ بھڑ بھس لگی کہ دیکھنے والے بھی تالی پھوپھو کریں۔ نہ جانے کب کا بڑا بول آگے آیا تھا۔ ان گنت دیکھنے والیاں روز چلی آتیں۔ بے چاری شرم سے پانی پانی ہوئی جاتی تھیں۔ لاکھ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتیں اور دوپٹے کے پلّو سے آگا پیچھا ڈھکنے کی کوشش کرتیں مگر پتلے سٹک سے جسم پر مٹکا سا پیٹ بھلا کیسے چھُپ جاتا۔ پھر وہ قطّامائیں جو دیکھنے آتی تھیں، کوئی ننھی کی جنیاں تو تھیں نہیں کہ یونہی واپس چلی جاتیں خدائی خوار چیل کی نظر رکھتی تھیں۔ بہتری تو چہرے کی بھر بھراہٹ اور جسم کے گدرے پن سے ہی سب کچھ بھانپ لیتیں اور دیدے پھوٹیاں اِدھر اُدھر کی باتیں کر ذرا سا پانی مانگتیں جیسے میر محمد علی کی بیوی نے ان کی اماں کے سگوں کی گٹھڑی چرا پیٹ میں اڑس لی ہو۔ جنم کے اندھے کو بھی صاف دکھائی دیتا تھا کہ چار مہینے سے کچھ دن اُوپر کا پیٹ ہے۔ اس پر بھی اُڑانے والیوں نے خدا جانے کیا کیا اڑا دیا تھا۔ کسی نے کہا لو ج! اِس بڑھاپے میں بچہ جنتے کبھی دیکھا نہ سُنا، پیٹ میں رسولی ہو گی۔ کوئی بولی، بُوا ٹھنڈا

پھوڑا ہے۔ میں تو جانوں جگر میں پانی اُتر گیا۔ بھلا غضب خدا کا، بوڑھی عورت نام خدیجہ۔ اس عمر میں بھی کوئی دوجیا ہوتا ہوگا۔ میر صاحب کی بیوی یہ باتیں سنتیں تو اندر ہی اندر کھولتی تھیں مگر یہ کہ پیٹھ پیچھے تو لوگ بادشاہ کو بھی بُرا کہتے ہیں۔ خلق کا حلق کس نے پکڑا ہے۔ یہ سوچ دل کو سمجھا لیتیں کہ بازار کی گالی ہنس کے ٹالی۔ جب چاند چڑھے گا تو کُل عالم دیکھے گا۔ البتہ اس خوف سے جان جاتی تھی کہ آنے جانے والیوں میں کوئی کیسا تھا، کوئی کیسا، بُرا بھلا پرچھاواں پڑا اور خدا نہ کرے کوئی اُونچ نیچ ہوگئی تو آگے امید بھی نہیں تھی۔ دشمنوں کا کہا سچ ہو جائے گا اور ان کی زندگی برباد ہوگی سو الگ اپنی مرن جگ کی ہنسی۔ کہنے والیوں کا کیا جائے گا وہ تو اور ہنس ہنس کے جلائیں گی۔ اوّل تو یہاں اُمید کسے تھی اللہ اللہ کرکے یہ دن نصیب ہوا تو دنیا والے گود کھائے جاتے ہیں، بدخواہوں نے بیچھا لے لیا۔ میں کون کہ خواہ مخواہ، کوئی سنے نہ سنے، کہنے والیوں کو تو بس کہنے سے کام تھا۔ للّو چلے ہی جاتی تھی۔ نامرادنیں بغضی تھیں۔ داتا دے بھنڈارے کا پیٹ پھٹے۔ ان کا بس چلے تو ایک دن اللہ میاں سے کہہ ساری دُنیا کا رزق بند کرا دیں۔ نہ خدا تو دے نہ میں دوں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ حسد کی لگی بُری ہوتی ہے۔ آدمی بے آگ بے پانی جلتا ہے۔ آئیں بُوا ہولتی اندر ہی اندر کھولتی تو ان مال زادوں کو تو للّہی بیر تھا۔ حالانکہ یہ سب پہ روشن تھا کہ میر صاحب نے بیوی کی گود بھرنے کی حسرت میں کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ سینکڑوں مسجدوں میں طاق بھرے۔ بیسیوں مزاروں پر ڈورے باندھے۔ ہرے درختوں میں تعویز لٹکوائے۔ معصوم بچوں کو صحنک کھلائی بی بی کی نیاز کے کونڈے بھرے۔ شیخ سدو اور لونا چماری کی منتیں کیں یہاں تک کہ چورا ہے کی مٹی منگا پلنگ کے پایوں تلے دبائی مگر ساری عمر نکل گئی اور نہ کچھ ہونا تھا نہ ہوا۔ اللہ اللہ خیر صلّا

یوں رہنے کو تو کئی پیٹ رہے۔ مگر جہاں مہینہ سوا مہینہ گزرتا میٹھے میٹھے درد ہوتے اور کچھ دن بعد سارا پیٹ پچ چپاتی سارہ جاتا تھا۔ نہ جانے کون کم بخت جھاڑو پھرا اندر گھسا بیٹھا تھا کہ دُنیا جہان کے علاج معالجوں کے باوجود دو مہینے سے اُوپر ایک دن

نہیں چڑھنے پاتا تھا۔ بے چاری ہر مرتبہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو جاتی تھی اور ان روز روز کے صدموں سے سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھیں۔ ناک پکڑو تو دم نکل جائے اوّل تو جیتا جیتا سیروں خون جاتا تھا۔ پھر یہ کہ بندھی آس ٹوٹتی لوہے کا کلیجہ ہو تو پانی ہو جائے وہ تو یہ کہو کہ اللہ میاں جسے غم دیتے ہیں، سہنے کی قوت پہلے دیتے ہیں۔ آخر کچھ دن بعد یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا تو لوگوں نے سمجھ لیا کہ میر محمد علی اپنی چھکڑا بھر دولت محلے کے مسٹنڈوں کے لئے چھوڑ کر مریں گے۔ آگے پیچھے تو کوئی تھا نہیں رشتے دار سُنا ہے سب مر مرا گئے تھے بس فقط دو دم تھے اور میر عاشق کے کوچے سے مرنے والوں کی گلی تک ساری چادڑی ان ہی کی تھی رہن سہن ایسا تھا جیسا عام آدمیوں کا ہوتا ہے بلکہ یہ سمجھئے کہ اور بھی معمولی۔ مایا کا کیا جوڑنا کھل کھانا کمبل اوڑھنا۔ کرائے کی آمدنی سستے زمانے میں بھی اتنی تھی کہ سُنا ہے گھر میں سونے کی سلیں تک تھیں اسی لئے یہ ارمان تھا کہ ان کے بعد ان کی دولت کا وارث اور نام لیوا تو کوئی ہو مگر یہ کہ خدا کے آگے کس کی پیش چلے اس کے حکم کے بغیر تو پتّا نہیں ہلتا۔ میاں بیوی نے سارے جتن کئے رات رات بھر دعائیں مانگیں جو جس نے کہا کیا پر جب کچھ نہ ہوا تو ہار کے بیٹھ گئے۔ مجبوری کا نام صبر

سُنا ہے میر محمد علی کی بیوی کے مائکے میں بیری تھی۔ کنوار پتے کی بات ہے شاید انہیں میٹھا برس لگا ہو کہ ایک دن گرمیوں کی دوپہر میں یہ جھولا جھول بیری کے نیچے کھٹولا ڈال کر سو گئیں۔ ویسے یہ کوئی نئی بات بھی نہ تھی ماشاء اللہ خوب رسا بسا گھر تھا۔ کونا کونا کِلا پڑا تھا مگر یہ کہ ہونی شدنی۔ گھر اپنا گھڑی پرائی، ذرا جھٹ پٹا ہوا اور دونوں وقت ملنے لگے تو کسی نے اس زور سے کمر پر لات ماری کہ یہ بلبلا کے اٹھیں اب جو چاہا کہ کچھ پڑھ کے پھونکیں تو غضب یہ کہ میلے سر سے تھیں۔ بس کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس دن کے بعد سے انہیں دورے سے پڑنے لگے اور لو جنیدی جمعرات کو تو خاص کر ایسی حالت خراب ہوتی کہ دیکھتے دیکھتے ہاتھوں میں آجاتی تھیں۔ کئی دفعہ تو اب سے دور، گھر والوں نے لٹھا پھڑوا لیا اور دُعائیں بھی کیں کہ اللہ اسکا

پردہ ڈھک لے تو اچھا ہے۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ لے لے کر کے تو سوتیلا بھی نہیں لیتی
ہر بار لوٹ پوٹ کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ مثل مشہور ہے کہ مردے کو سب گاڑتے
ہیں زندہ کو کوئی نہیں گاڑتا۔ جان کے ساتھ سارے جھمیلے ہیں۔ کچھ دن تک ماں
باپ نے تعویز گنڈے کیئے۔ جھاڑنے پھونکنے والوں کے پاس لیئے لیئے پھرے
ملا سیانوں کو دکھایا مگر جب ایک روز قوالی میں سر والوں نے صاف صاف
کہہ دیا کہ جنم کے سب ساتھی ہیں کرم کا کوئی ساتھی نہیں۔ جس پر پڑتی ہے وہی سہتا ہے
کچھ دن یوں ماں باپ لیئے بیٹھے رہے۔ پھر انہیں کسی ایسے لڑکے کی تلاش ہوئی جو
خوب دان دہیز کے لالچ میں اس بوجھ کو اپنی چھاتی پر دھر لے کم از کم وہ تو فرض
سے ادا ہو جائیں گے۔ مردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں بات کوئی چھپی تو رہتی
نہیں۔ سارے شہر کو پتہ تھا کہ لڑکی پر اُوپری سایہ ہے اور یہ کہ سر والے بڑے
جید ہیں پھر بھلا کس کی ماں نے دھونسا کھایا تھا بیٹھے بٹھائے سانپ کے بل میں
ہاتھ دیتا۔ ہاں میر محمد علی نے آنکھوں دیکھے مکھی کھائی۔ پیسے کا لوبھ کیا۔ سوچا
گرٹیں گڑ ڈالو تو اور میٹھا ہو گا۔ اس لالچ میں شادی کر لی سو اب پچتانے سے کیا
ہونا ہے اپنے کیئے کا کیا علاج۔ چور کی ماں اوکھلی میں سر دے اور روئے۔
خیر یہ سب تو پرانے قصے ہیں۔ گڑے مُردے اُکھاڑنے سے کیا حاصل
ہے اَب تو مدت سے میر صاحب نے ہار کے گردن ڈال دی تھی۔ اور ان کی
بیوی نے بھی جو صدمے اُٹھاتے اُٹھاتے وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہو گئی
تھیں، اپنے تئیں لاولدی میں ہی مطمئن کر لیا تھا۔ کئی کئی مہینے سوکھے گذر جاتے
اور انہیں خیال تک نہ آتا کہ یہ سوتیں خشک ہونے والی ہیں۔ پھل تو پھل پھول بھی
رُخصت ہو جائیں گے اُلٹا اللہ کا شکر ادا کرتیں کہ اس نے انہیں پاک صاف
کیا۔ بڑھاپے میں جنت کے لیئے چلے کھینچیں گی۔ زندگی تو جوں توں گذر ہی گئی
آخرت سنور جائے تو جانو سب کچھ پا لیا۔ کبھی دل کو سمجھاتیں کہ جیئے نہ جیئے پر جن
کے تو ہم نے بھی دیکھ لیئے۔ یہ پنج لی، جہاں کی نعمت پائی، موئے اولاد والے

کون سے خوش ہیں جو ہماری اولاد ہوتی تو ہم نہال ہوتے ۔ آدمی کی تو جندری ہی بے چین ہے ۔ وار والا کہے پار والا بھلا اور پار والا کہے وار والا بھلا غرض تسلیاں تو خود کو بہت دیتی تھیں مگر ایک کانٹا جو دل میں چبھا تھا وہ تیر کی طرح کھٹکتا رہتا تھا ۔ وہ جو کہتے ہیں کہ کنوارا ارمان بیاہتا پشیمان دل ہی دل میں کڑھا کرتیں اور اپنے پروردگار سے گڑگڑا گڑگڑا کے دعائیں مانگتی تھیں سو اللہ کی رحمت کے قربان جایئے اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ۔ آخر ایک دن اس نے سن ہی لی تو اب اس کے بندوں نے کوسنا شروع کر دیا۔ پوچھنے والے ایسا منہ بھر بھر کے پوچھتے تھے کہ بے چاری میر صاحب کی بیوی کے دل میں ہزار طرح کے وہم گذر جاتے ۔ بتائیں تو مصیبت اور نہ بتائیں تو مصیبت ۔

ہاں تو ہوا یہ کہ شروع شروع دو تین مہینے تک تو میر صاحب کی بیوی کو خود بھی پتہ نہ چلا ۔ جب خیر سے چوتھا مہینہ لگا اور انہیں روغن جوش قورمے دو پیازے سے ابکائیاں آنے لگیں ، چکنی مٹی ، ملتانی اور سکوریوں کی ٹھیکریوں کو جی چاہا تو وہ سب کچھ سمجھ گئیں ۔ بیاہ نہ کئے پر براتیں تو دیکھی تھیں بیٹھے بٹھائے سارے بدن میں آگ سی پھنکتی اور وہ غسل خانے میں بڑا خوب ٹھنڈے پانی سے تڑ تڑیڑا کرتیں ۔ ہزارے سے منہ پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار چھوڑتی تھیں میر صاحب کے چونچلے کا یہ حال تھا کہ شام کو گھر آتے تو بڑے بڑے ڈھاک کے پتوں میں لپٹی سفید سفید گجراتی موتیا کی بالیاں ضرور لاتے تھے انہیں پہن کر میر صاحب کی بیوی ، چشم بد دور بوڑھ سہاگن بن جاتی تھیں ۔

کچھ دن بعد جب گلابی جاڑا پڑنے لگا ، کنوار برس کر ختم ہونے کو آیا تو میر صاحب کی بیوی کا ساتواں مہینہ تھا انہوں نے صدریاں اور نیم آستینیں نکال کر پلیٹیں کھول دیں ۔ جامدانی کی رضائی میں صوفیانہ سی مغزی لگا اوڑھنے کے لئے تیار کر رکھی ۔ چیکے چیکے کچھ کلوٹ ، دوہرین ، سینہ بند دلائیاں

اور نہالچے بھی سی کر رکھ لئے ۔ اکیلا ہاتھ وقت پر ضرورت پڑے گی تو سب کچھ کہاں سے آئے گا۔ نہ میکا نہ سسرال اور کسی مغلانی کو بلا کے سلواتیں تو چار سکھے میں بات پھیلتی ۔ موئی بدگوئیوں اور کل جیبوّں کا خطرہ ۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میر صاحب کی بیوی نے خدا انہیں نظرِ بد سے بچائے ساتواں مہینہ پکڑا تھا ۔ اس لئے ہزار طرح کی احتیاطیں ہو رہی تھیں ۔

کچھ دن تو وہ آنے جانے والیوں کو خاموشی سے دیکھا کیں ۔ شاید آپ ہی رُک جائیں مگر جب وہ نہ مانیں تو ایک دن ایسے لتے لئے کہ آگے ان کا ہبا ؤ ہی نہ پڑ سکے ۔ یہ کانٹا نکلا تو نئی نویلی زچّہ بن پلنگ پر لیٹ گئیں میر صاحب خود ساری عمر کی کمائی پھونکنے کو تیار بیٹھے تھے ۔ پکانے کے لئے ماما اور دیکھ بھال کو خادمہ لگا دی ۔ کبھی اُٹھتیں بیٹھتیں تو ایسے جیسے سچ مچ کانچ کی گڑیا ہوں ۔ طشت چوکی پائینتوں لگ گئی ۔ تر پھلے سے آبدست لی جانے لگی ۔ پلنگ کے نیچے اترنے کا کوئی کام ہی نہ تھا ۔ بس کبھی کبھی اولیا دائی آتیں تو دو چار قدم ہاتھ پکڑ کے میوّں میوّں چلاتیں تھیں کہ ننھی سی جان ٹھٹھس کے نہ رہ جائے ۔ صبح صبح پہلے خادمہ سلفچی، آفتابہ اور کھلی دانی لے خدمت میں حاضر ہوتی ۔ منہ دُھلا رو پاک سے خشک کرتی پھر پھلیل دان آگے رکھ سنگار کراتی مقابہ کھول، کنگھی چوٹی کرتی، سرمہ لگاتی، مسّی اور لاکھے کی دھڑی جماتی ۔ اس کے بعد ململ کی بقچی میں بندھا جوڑا آگے رکھ ایک چادر سے اوٹ کر کے کھڑی ہو جاتی تھیں یہ جوڑا بدل چکتیں تو کالا دانا اتارا جاتا ۔ مرچیں سر سے پیر تک چھوا کے جلائی جاتیں اور خدا جانے کیا کیا ٹوٹکے ہوتے تھے ۔ میر صاحب روز اپنے ہاتھ سے ایک قندھاری انار چھیل کر بیگم کو کھلاتے تھے لال تن کے سفید سفید ککیری کٹاؤ والے کسنے، جن میں آلو بخارے، کالی منقّہ اور انار دانہ بھرا ہوتا، مسہری کے پائے میں اوقچہ بند کے ساتھ لٹکے رہتے تھے کہ زچہ کا جی بُرا ہو تو ہاتھ بڑھائیں اور کھالیں غرض یہ کہ میاں نے ہتھیلی کا پھپھولا بنا رکھا تھا ۔ ملنے والیاں دیکھتیں تو اسی

آگ میں جلی مرتی تھیں کہ اُنہوں نے دس دس بچے جنے اور ان کے مونڈی کاٹے خصموں نے ذرا پرواہ نہ کی ۔ میر صاحب کو دیکھو کہ اپنی عورت کے اشاروں پر تگنی کا ناچ ناچ رہے ہیں ۔ خدا دیکھے کو نہ دکھائے ان دیکھے کو نہ دکھائے زچہ نہ ہوئیں تو یہ ہے اور ان سے توران ہو گئیں ۔ ایک فیل مچا رکھا ہے اور خدا جانے پھر بھی کچھ ہو گیا ۔ یونہی ایک دن پلیتھن نکال بستر سے کھڑی ہو جائیں گی ۔ پیسیا پیسیا اور چینی بھر اُٹھایا ۔ بھڑمیا بھاری پٹارا خالی ۔

ساتواں مہینہ ختم ہوا اور دائی نے دیکھا تو خوب خوب مبارکبادیاں دیں ۔ بچہ خدا رکھے صحیح سلامت تھا مگر یوں سیدھا سادا جاپا کرانا بھی تو عورت کو قبر جھنکانے کے برابر ہے ، شمال جنوب لٹاتے ہیں کہ دیکھئے زندہ بچتی ہے یا نہیں تندرست بچہ چھوٹا پیٹ اس پر طرہ یہ کہ دھان پان زچہ اسی لئے اس نے میر صاحب کو کل کیفیت سے آگاہ کر دیا ۔ اچھی کری خدا نے بُری کری بندے نے ۔ کچھ بگڑ بگڑا گیا تو اس کے چندیا پہ تو اتنے بال بھی نہ تھے کہ نچوا لیتی میر صاحب نے سنتے ہی صدقے کے بکرے کروائے غریبوں میں گڑ چنے تقسیم کئے اور چوک پہ جا کئی بیسی طوطے چھڑوائے دائی کو مستقل گھر میں رکھا ۔ کیوں کا کیا کہ وقت پر کل چیز گھر ہی میں نکل آئے اور ہر دم اللہ اللہ کرنے لگے ۔ بیوی کا یہ حال کہ خوشی سے دیوانی ہوئی جاتی تھیں ۔ سینے پر کٹوریوں میں ہلکی ہلکی تندی آنے لگی اور جب وہ آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ انگیا کی کوارٹیوں پر رکھتیں تو ایک انجانی لذت سے ان کا رواں رواں جھوم جاتا تھا ۔ یہ بیقراری اور بے چینی دیکھی تو دائی نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگایا کہ جذبات کے ہیجان سے بچہ نیچے نہ سرک آئے مگر اس کی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور ایک روز عصر کے بعد میٹھے میٹھے درد شروع ہوئے پھر یہ درد خوب بڑھ گئے اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں بچہ پیڑو کے بالکل قریب آن لگا ۔ دائی نے جو دیکھا کہ اب رکنے میں زچہ اور بچہ دونوں کی جان کا خطرہ ہے تو نیچے تکیہ رکھ کر پیٹ پر ہلکی ہلکی تھپلی دینے لگی ۔

میر صاحب نے گلی کے بچوں میں گڑ چنے بٹوائے اور تھوڑی ہی دیر میں اللہ نے مشکل آسان کر دی۔ آنول پکڑ زچہ کو بتایا کہ کالی بیٹی ہے تاکہ ہول اُٹھے تو نال آسانی سے باہر آجائے مگر خود جو دیکھا تو ستواں اور کھڑے کھڑے ناک نقشہ کا نازک سا لڑکا تھا۔ ناخن اور کھال ابھی کچے کچے نرم نرم تھے غسل کرائے بغیر کمر پر ہتھیلی مار تانتواں توڑا، سر دبا کے گول کیا، پھر ناک اُٹھا، بچے کو تیل کے بادیئے میں ڈال دیا۔ نال اڑس زچہ سے کہا مبارک ہو اللہ نے ہاتھ پیروں سے فراغت کیا دو چار دن میں پلنگ کو لات مار کھڑی ہوتی ہو۔ لو بوا اللہ نے مجھے سرخرو کیا۔ پھر ذرا سی اچھوانی پلوائی اور بچے کو روئی کی بتی بنا شہد چٹایا دو ایک دن تو بچہ شہد اور گھٹی پر رہا کہ ماں کے پیٹ کا کچرا صاف ہو جائے پھر جب تیسرا دن ہوا تو میر محمد علی کی منہ بولی بہن نے زچہ کے بالوں کی ایک لٹ اور چھاتی آٹے کے دودھ سے دھلا پہلے پانچ اشرفیاں نیگ کی وصول کیں پھر بچے کو دیں اُٹھا ذرا سا بتاشوں کا چورا پھونک دودھ منہ میں دیا تو وہ ڈر ڈر کے کلبلانے لگا۔ اس کے ورق جیسے پتلے شہابی ہونٹ ماں کی لجلجی لجلجی ربڑ جیسی ٹھنڈی چھاتیوں سے چھوئے تو اس نے ہڑبڑا کے دودھ چھوڑ دیا اور منہ بنا بنا کے پھریریاں لینے لگا۔ لٹکے ہوئے ڈھیلے ڈھالے پستان خدا معاف کرے، ایسے لگتے تھے جیسے مردے نہلانے کی تھیلیاں اور جلد کے شکر پارے اس طرح پھیل گئے تھے جیسے سوکھا پڑنے پر کھیتوں کی زمین پھٹ جاتی ہے۔ ننھے منے ملائم ہاتھوں سے سینہ ٹٹولا تو کمانچوں نما سخت پسلیوں اور جھری دار کرخت کھال کے لمس سے اس پر ہیبت طاری ہو گئی پہلے کچھ دیر تو اس خمیری آٹے کو اپنی نرم نرم انگلیوں سے گوندھا کیا جب اس میں کسی طرح گرمی نہ آئی تو بڑے فیصلہ کن انداز میں پرے ہو گیا۔ آس پاس والیاں سمجھ گئیں کہ بچہ اُوپر کے دودھ پر پلے گا۔

میر صاحب کی بیوی نے جو اپنے پیٹ کے کیڑے کو گھن کھاتے دیکھا تو ان کے دل پر دھاکا لگا اور دو چار روز میں وہ بتاشے کی طرح بیٹھ گئیں۔ اِدھر بچے کی چھٹی ہوئی اُدھر ان کا جنازہ تیار تھا۔

بیوی کے مرنے کا میر محمد علی کو غم تو بہت ہوا۔ بڑھاپے میں رنڈوا ہونا مرنے سے بدتر ہوتا ہے مگر پھر بچے کی طرف دیکھا تو اپنا سارا غم بھول گئے۔ انہیں اس ننھی سی جان کی فکر ہوئی۔ اب اگر وہ رونے دھونے میں لگ گئے تو اسے کون دیکھے گا۔ کہیں یہ بھی اللہ کو پیارا ہوا تو وہ جیتے جی مر جائیں گے۔ پھوٹی آنکھ کا ایک ہی دیدہ اس گوشت کے لوتھڑے کی خاطر وہ آج تک جیتے تھے۔ خدا جانے ایمان بھی رہا یا نہیں۔ ندیدے کے گھر کا ملیدہ، چوہے کو ہلدی کی گرہ۔ وہ رہ رہ کر یہی سوچتے تھے کہ کون سی تدبیر ہو کہ یہ ننھی سی جان، اللہ رکھو، پل پلا کر بڑی ہو اور ان کی آنکھوں میں اسے دیکھنے سے طراوت آئے۔

چاوڑی کے کوٹھوں پر ان دنوں طوائفیں رہتی تھیں۔ میر صاحب کرایہ وصول کرنے جاتے تو دو گھڑی تماش بینی بھی کر لیتے تھے۔ مفت کی شراب تو قاضی کو بھی حلال ہے۔ طوائفیں اگلے زمانے کی باوضع، لحاظ مروت والیاں اگر کبھی برسوں کی برسات میں میر صاحب نے پاس بٹھا کے روپیہ دو روپیہ دینے بھی چاہے تو انہوں نے دیدے اوپر چڑھا لیوں منع کر دیا جیسے یہ ایک گناہ عظیم ہو۔ ایسے جھمالوں سے لیکے کیا انہیں اپنی گز بھر کی ناک کٹانی تھی پھر یہ کہ حکت نائیکا خوشنودی جان سے میر صاحب کے جوانی میں کچھ مراسم بھی رہے تھے اور جتنے کوٹھے آباد تھے سچ پوچھئے تو خوشنودی کے دم سے آباد تھے۔ وہ بڑی ٹھسے کی عورت تھیں۔ کبھی ہلکے ہلکے سروں میں گیت گاتیں تو ایسا لگتا جیسے آسمان سے باجرہ برس رہا ہو اور جب پنچم میں الاپیں اٹھاتیں تو بھادوں کے بادل گرجنے لگتے تھے۔ نرت کار بھی غضب کی تھیں۔ ایسے ایسے بھید بھاؤ بتاتی تھیں کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ خود راجوں مہاراجوں میں رہی تھیں جو ان کے پاس کچھ نہ رہ گئی پارس کی ہو گئی۔ رئیسوں کی رکھیل بنی۔ ناچنے والیاں پیروں سے گھنگھرو باندھتیں تو پہلے خوشنودی کا نام لیتی تھیں، پیچھے ناچنے کھڑی ہوتی تھیں۔ البتہ پچھلے دنوں ایک ان گھڑ، بیہودہ سی اچھال چھکانے ان کی ساری آبروٹی میں ملا دی تھی۔ بنی بنائی ساکھ بگاڑ دی۔ ہوا یہ

اس پہ جوانی چڑھی تو آنکھوں پہ چربی چھاگئی ۔ موئی بن کری بچھیا کی طرح دونڈائی دونڈائی پھرا کرتی تھی ۔ بی خوشنودی نے کئی بار سمجھایا کہ رنڈی کے پیشے کو لوہے کا کلیجہ چاہیئے ۔ اگر یہ گری پڑی عورتوں کی طرح بیسوا بن ہما شما پرواری صدقے ہونے لگیں تو یتیموں کی فوج کھڑی کرلیں ۔ آدمی کو اپنے جامے میں رہنا اچھا ہوتا ہے ۔ ہماری سنے گی تو سدا سکھ اُٹھائے گی ورنہ تو جان اور تیرا کام جانے ۔ یہ بات بی خوشنودی بڑی محبّت سے سمجھاتی تھیں ۔ پھر آنکھیں موند سراپا تشکّر بن ماضی کے اوراق پلٹنے لگتیں اور بے اختیار بڑبڑاتیں "اللہ نے جیسی ہماری گذروائی ایسی سب بہو بیٹیوں کی گذروائے"۔

ان خوشنودی جان کو زمرد حرافہ نے ناک چنے چبوائے تھے رشتاہ منہ سے خصم مانگتی تھی ۔ زمردان کی زرخرید لونڈی تھی ۔ پوتڑوں میں سودا ہوا تھا ۔ رنڈی اور پہلوان کا بڑھاپا بُرا ہوتا ہے ۔ سوچا داشتہ آید بکار میرے ہاتھ پاؤں تھک جائیں گے تو زمرد جوان ہوگی ۔ عزت سے مرجاؤں گی یہ کسے خبر تھی کہ زمرد نامراد تو جی کا جلاپا ثابت ہوگی ۔ کام کی نہ کاج کی ڈھائی سیر اناج کی ۔ حرام ہڈ، مردار خور، ذرا ہاتھ پاؤں سے پُرکار ہوئی اور انہوں نے بنا سنوار ایک دن محفل میں پیش کیا تو وہ اپنے تئیں بیگم ہی سمجھنے لگی ۔ کم بخت صورت کی اچھی تھی ۔ گھڑی بھر محفل میں بیٹھ جاتی تو موتی بٹور لیتی تھی ۔ ان گنت روپیہ رولتی اِتنا کہ صرف بوا خوشنودی ہی کی نہیں ان کے لگّے ماتروں کی بھی دوزخ بھر جائے ۔ خوب لانبا نکلتا ہوا قد تھا ۔ بدن جُلاہے کی کھڈی کی طرح گٹھا ہوا تھا، صحت مند، شیشے کی طرح صاف سینہ اور کولہوں کی ایک ناپ، کمر چھلّاسی ۔ لمبی صراحی دار گردن، کتابی چہرہ، بھری بھری گوشت سے لپی گالوں کی ہڈیاں، ناک ذرا چھوٹی مگر اُٹھی ہوئی، ٹھوڑی ایسی جیسے بنارسی لنگڑے کی کیری، لبوں پہ مسی اور لاکھے کی دھڑی جماتی تو یوں لگتا جیسے ریشم کے جال میں ہلایا ہوا کالا کالا اودا اودا شہتوت ہو آنکھیں بھی خوب روشن تھیں لمبوترئی، موتی کٹے، شربتی رنگ کی ۔ ان میں شبنم کے قطرے ہر وقت تیرتے رہتے تھے اور پلکیں ایسی دراز کہ آنکھیں جھپکتیں تو یہ محسوس ہوتا

کہ دو موڑ چھل ہلتے ہیں۔ گول بھری بھری سیسے کی طرح سخت رانیں۔ ان کے اوپر کولہوں کا ہلکا سا گھیراؤ، گاؤدم پنڈلیوں پہ ننھے ننھے گلدستہ سے پیر۔ دراز ہاتھوں کی نازک نازک انگلیوں سے یوں بول بتاتی تھی جیسے مریم کا پنجہ پانی میں ہلکے ہلکے ارتعاش کے ساتھ کھلتا ہے۔ سارا جسم بلور کا بنا تھا۔ سر سے پاؤں تک نور کے سانچے میں ڈھلی تھی۔ ایک عیب تھا تو بقول خوشنودی یہ کہ دل کی بری تھی۔ اور بھی بات انہیں زہر لگتی تھی۔ ڈیرے دارنی ہو کے چاؤ چونچلے کرے گی تو دو دن میں کھک ہو جائے گی۔ گھوڑا گھاس سے یارانہ کرے تو پیٹ کہاں رکھ آئے۔

بوا خوشنودی کا کوئی دماغ تھوڑی پلٹا تھا کہ ٹانگ برابر کی چھوکری سے تو تو میں میں کرتیں۔ چڑھتی جوانی اور گرم خون کچھ کہہ کہوا دیا تو کیا ہو گا، سوچا بیگن کا پانی بیگن میں مرنے دو۔ کچھ دن گذرنے پر آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ ابھی بچہ ہے۔ بار بار سمجھاؤں گی تو اور ضد پکڑے گی۔ موا وہ جسے منہ نہ لگائے اور زمرد شاید اس ڈھیل کی تاک میں تھی کہ چھولوٹوں تو لوٹوں بازار۔ عورت رکے تو آپ سے ورنہ جائے سگے باپ سے یوں تو رنڈی کے گھر بادشاہ کے محل جتنا پہرہ ہوتا ہے مگر فطرت تلوار کے سائے میں بھی اپنا اظہار کرتی ہے۔ خدا جانے کون سی منحوس گھڑی بی خوشنودی کی آنکھوں پر پردہ پڑا کہ زمرد جان نے ان کا سارا غرور ڈھا دیا۔ برسوں کی بنی عزت خاک میں مل گئی۔ ہاتھ ملتیں اور گود پھیلا پھیلا کر کلموہی جوانا مرگ کو کوستی تھیں۔ ہائے ہائے اصل سے خطا نہیں کم اصل سے وفا نہیں۔ ایک میں کہ اس گندے کیڑے کو اولاد کی طرح پال پوس کر بڑا کیا اور ایک یہ کہ بڑھاپے میں میرے سفید چونڈے کو کلف لگا دیا۔ غضب تو یہ ہوا کہ انہیں بھی اس وقت پتہ چلا جب کافی دیر ہو چکی تھی۔ بے چاری کے سان دگمان میں نہ تھا کہ زمرد حرافہ یہ گل کھلائے گی ورنہ اس کے کھائے پیئے، ڈھکے چھپے سب پر نظر رکھتیں۔

اب بھی راز یوں کھلا کہ ایک روز زمرد نے صبح سویرے چارپائی سے نیچے قدم اتارا تو سارا فرش ہل گیا۔ ویسے بھی ماشا اللہ وہ صحت مند۔ ڈیل ڈول کی عورت

تھی مگر خوشنودی کا ماتھا کسی اور ہی بات پر ٹھنکا اب جو غور سے دیکھا تو اپنے بال نوچنے لگیں سر پیٹ پیٹ کے رہ گئیں۔ اُنہوں نے سوچا تھا کہ ننھا اتروائی کے پچیس تیس ہزار ملیں گے تو دس کام نکلیں گے کوئی پندرہ ہزار تو اصل اور سود ملا کر مہاجن ہی کے نکلتے تھے۔ خوشنودی جان کی نظر میں شہر کا ایک ایک حیثیت دار شوقین تھا۔ بس ذرا سے اشارے کی دیر تھی مگر وہاں تو یہ کلونتی، غارت گئی، خدا جانے کس بھک منگے اُٹھائی گیرے کا پاپ پیٹ میں لئے بیٹھی تھی۔

خوشنودی جان کو جو جو نسخے یاد تھے سبھی تو انہوں نے زمرد کو استعمال کرائے، منوں سرکہ اور پیاز کا عرق پلا دیا، عصارِ ریوند کے جلاب دیئے پرانے ٹاٹ اور گڑ کی گولیاں بنا بنا کے کھلائیں سنبھالو کے پتوں کا جوشاندہ پلایا۔ اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو مالشیں کیں، کُمہا اینٹیں ہاتھ بھر کے فاصلے پر رکھ کے ان پر اکڑوں بٹھا دیا کس کس کے پٹیاں باندھیں کوکھ میں گھونسے مارے مگر بچہ ایسا کھنکھجورے کی طرح جما بیٹھا تھا کہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ جسے خدا رکھے اُسے کون چکھے۔ جب کچھ نتیجہ نہ نکلا تو دل میں نہ جانے کیا ٹھان کے خاموش ہو رہیں۔ خدا کے آگے ہاریں تو ہاریں۔ بی خوشنودی اپنے آگے کے بچے سے ہار جائیں یہ ممکن نہ تھا۔

آخر ایک دن وہ منحوس گھڑی آگئی جب انہوں نے زمرد سے انتقام لیا۔ کمہار پہ بس نہ چلا گدھیا کے کان اینٹھے۔ اِدھر بچہ پیٹ سے باہر آیا، اُدھر اُنہوں نے گڑھا کھود دبا دیا۔ خس کم جہاں پاک اور جتنی دیر میں ہوش آیا اتنی دیر میں تو قصّہ ہی تمام تھا۔ بے چارہ بچہ تو جہاں سے آیا تھا وہیں چلا گیا، چند سانسوں کی زندگی تھی سو پوری کی مگر زچہ نے رو رو بُرا حال کر لیا۔ سمجھانے والیوں نے لاکھ سمجھایا پر وا اب خاک ڈالو جو ہونا تھا ہو گیا۔ زندگی ہے تو بچوں کی کیا کمی رکھی کھیتی ہے ایک چھوڑ دس ہو جائیں گے مگر وہ تو ایکساں یہی رٹے جاتی تھیں کہ ایک اللہ جان دیدونگی نہیں تو میرا بچہ مجھے لادو۔ زمرد سمجھتی تھی بڑھیا نے ضد میں اِدھر اُدھر کر دیا ہے یہ کیا خبر تھی کہ وہ ڈائن اس ننھی سی جان کو نگل ہی گئی۔ تیسرے چوتھے دن تو زمرد پاگل ہو گئی رو رو کے آنکھیں انگارہ کرلیں دیکھے سے خوف

آتا تھا۔ ادھر چھاتیاں دودھ کے زور سے پھٹی پڑتی تھیں نیلی نیلی وریدوں میں خون کے کھنچاؤ سے کنکھجوؤں کی طرح ابھر آئی تھیں۔ خوشنودی جان یہ دیکھ کر گھبرا گئیں اور چاہا کہ نمک اور تیل مل کے سارا دودھ کھینچ لیں مگر زمرد بھو کی شیرنی کی طرح بپھر گئی۔ وہ کب ان پھپھڑ دلالوں میں آنیوالی تھی۔ اپنے خون کے بیری سے کاہے کا لحاظ۔ اس کا بس چلتا تو چڑیل کے تکے بوٹی کر کے آسمان والیوں کو دیتی۔

اڑتے اڑتے یہ خبر میر محمد علی کے کان تک بھی جا پہنچی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ وہ تو کسی دودھ پلانے والی کی تلاش میں تھے ہی جھٹ بچے کو لے پہنچ گئے زمرد نے اسے اپنے گداز اور نرم نرم سینے سے لگایا تو ایسا لگا جیسے سوکھے دھان میں پانی پڑا۔ نگوڑے گلگلے سے بچے نے تروتازہ جسم کی بو سونگھی تو بیر بہوٹی کی طرح ابجے ننھے کھول دیئے اور ذرا دیر میں مرغی کے چوزے کی مانند چونچال ہو گیا۔ پھر دودھ منہ میں دیا گیا تو چسر چسر خوب ڈہڈہا کے پیا اور ساتھ ساتھ زمرد کی دکھتی ہوئی پھوڑا سی چھاتیوں کو اپنی مٹھی میں لے ایسا گوندھا کہ اس کا سارا درد کافور ہو گیا۔ کہتے ہیں بچے کا پیٹ اور کان کی لوک جتنی بڑھاؤ اتنی بڑھ جاتی ہے زمرد کو دودھ پلانے میں مزا آتا تھا وہ کیوں خست کرتی۔ صبح شام میں ڈھائی سیر دودھ ایک چھاتی سے اور ڈھائی سیر دودھ دوسری چھاتی سے پلایا تو کچھ ہی دن میں بچہ ایسا گل گوتھنا ہو گیا کہ اُن ہوئے کو پیار آتا تھا۔ میر صاحب روز شام کو بلا ناغہ بچے کے پاس آتے اور اسے دیکھ دیکھ کر پھولے نہیں سماتے تھے۔ پھر خدا جانے میر محمد علی اور زمرد جان میں کیا ساز باز ہوئی کہ ایک دن زمرد کی ڈولی ان کے گھر آ گئی۔

زمرد میر صاحب کے گھر پڑی تو اس کی زندگی کا رُخ ہی بدل گیا۔ اب وہ پہلی سی اُدھال دھینگڑی، زمین کوٹنے کا انجن نہ تھی بلکہ ایک متین سنجیدہ اور برد بار عورت تھی۔ بڑے گھر کی اونچی اونچی چار دیواری میں اتنے ہولے ہولے بولتی کہ آواز ڈیوڑھی تک بھی مشکل ہی سے پہنچنے پاتی تھی۔ پردہ کرنے میں اس نے بڑی بڑی شریف زادیوں کو بھی پیچھے بٹھا دیا تھا۔ دروازے پر جو بڑے میاں سودا سلف لانے کو ملازم تھے ان کی بات اور تھی ان سے تو خیر دو آنکھوں میں فقط ایک ناک کا پردہ تھا ورنہ کیا مجال کہ غیر مرد

نے اس کا سایہ بھی دیکھا ہو۔ میر صاحب غریب میں تو اَب رکھا ہی کیا تھا۔ بالکل قلمی شورہ ہو گئے تھے۔ مشکل سے برس دن میں دو چار دفعہ بات کرتے ہونگے مگر اس کے باوجود زمرّد بڑی سیر چشم دِکھائی دیتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ عورت ہے ہی نہیں بس ماں ہے۔ اس نے اپنی ہر خوشی بچے کے لیئے قربان کر دی تھی۔ سارے سارے دن اس کے آگے پیچھے پھرا کرتی تھی۔ وہ ایک لمحے آنکھ سے اوجھل ہوتا تو اس کا دم نکل جاتا تھا صبح اُٹھتے ہی سب سے پہلے وہ اس کے سارے جسم کو زیتون کا تیل پلاتی۔ پھر جبڑھوں اور بغلوں میں کاشغری سفیدہ چھڑکتی۔ انڈے بچے صاف کرتی۔ اس کے بعد سیتے سیتے پانی سے نہلا کے اچھی تراش خراش کے خوب صورت کپڑے پہناتی اور ایک طرفہ باتیں کیئے جاتی تھی۔ کبھی زمین پہ چت لیٹ کے گھٹنے موڑ اسے اپنے پیروں پر بٹھا جھو جھولے جھلاتی تھی اور کبھی اس کے ساتھ اٹکن بٹکن اور اچھیا چھیا کھیلا کرتی تھی۔ پھر جب وہ ذرا بڑا ہوا تو یہ گھٹنے اور ہتھیلیاں زمین پر ٹیک گھوڑا بن اسے اپنی کمر پہ بٹھاتی اور گھر کا کونا کونا جھنکاتی پھرتی تھی ایک آن اپنی جان سے جدا نہ کرتی تھی۔ بوڑھے مردوئے کو بندریا کے بچے کی طرح سینے سے چمٹائے چمٹائے پھرا کرتی۔ کوئی پانچ سال سے زیادہ تو دُودھ پلایا ہوگا اور جب دودھ بڑھا دیا تب بھی کبھی کبھی ضد کرنے پر اس کے آگے سینہ کھول کے لیٹ جاتی تھی۔ وہ پہلے تو اپنے دونوں ہاتھوں سے بھری بھری چھاتیوں کو خوب نوچتا پھر ہونٹوں کی حرکت سے کوشش کرتا کہ دُودھ اُتر آئے مگر جب دودھ نہ آتا تو اپنے سوئی جیسے دانتوں سے ایسا کچکچا کے کاٹتا تھا کہ زمرّد کی جان نکل جاتی تھی۔ اس پر بھی کبھی دھمکانا تو بڑی بات ہے ٹیڑھی نگاہ سے نہ دیکھا تھا۔ خدا جانے اپنا خون ہوتا تو کیا حال کرتی۔ پرائی اولاد پہ اس نے ہستی کو مٹا دیا تھا۔ ایکساں نظر جمائے اسے تکے جاتی تھی۔ اس کی ایک ایک ادا دیکھتی اور سر سے پیر تک چوم چوم کے بلائیں لیتی تھی دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ اگر ہفتہ عشرے میں کبھی نہانے یا انگول کرنے بیٹھتی تو وہاں بھی اسے پینڈا ملوانے ساتھ لیجاتی تھی۔ یہ آملوں اور ریٹھوں کے پانی سے سر بھگوتی، وہ سینہ کمر، پیٹ اور بغلوں سے میل کی بتیاں اُتارا کرتا تھا۔ کئی مرتبہ محلّے کی بڑی بوڑھیوں نے ٹوکا بھی کہ بوا خدا رکھے سیانے

بچے کے آگے ننگا کھلا بیٹھنا اچھی بات نہیں ہے مگر زمرد نے سنی ان سنی کر دی۔ وہ تو اسے اپنے جسم کا ایک انگ سمجھتی تھی جبھی تو غضب خدا کا جوان جہان ڈھینگ کے ڈھینگ کو مسہری پر اپنے ساتھ سلاتی تھی۔

بات یہ ہے کہ وہ رات کو سوتے سوتے ڈر جاتا تھا۔ بالکل ننھا سا دل تھا اُسکا چڑیا جیسا۔ زمرد پاس لیٹتی تو اس کا بھاری بھرکم وجود اس کے دھڑکتے دل کو سنبھالے رکھتا تھا۔ وہ اپنی نرم، چکنی ٹانگوں کو زمرد کی سڈول، مرمریں زانوؤں میں اس طرح پھنسا دیتا تھا کہ اس کی پنڈلیوں کا ہلکا ہلکا ریشمی اور سنہری رواں بھی لوٹ کے جھڑ جاتا تھا پھر جب زمرّد اس کے سیب جیسے ٹھنڈے گالوں پر اپنا تمتمایا ہوا توے کی طرح جلتا رُخسار رکھتی تو اس کے سارے بدن میں جھرجھری آجاتی ننھی جسم ڈھیلا پڑ جاتا تھا اور ٹانگیں ذبح کئے ہوئے بکرے کی ٹانگوں کی طرح جھولنے لگتی تھیں۔ اس غنودگی کے عالم میں اس پر ایک سپردگی کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی اور وہ سمٹ سمٹا کے گٹھری بن جاتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے زمرّد کا آغوش اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔ پھر جب زمرّد اپنے بھرے بھرے بازوؤں میں اسے محبّت سے بھینچتی تھی تو اس کے روئیں روئیں پر ایک انجانی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ یوں جیسے کوئی ہلکے ہلکے گُدگُدیاں کرتا ہو اور وہ اپنے آپ کو اس نرم، گداز آغوش کے حوالے کر دیتا تھا۔ زمرّد اس کے گھونگھر والے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتی تو اس کا جی چاہتا کہ یہ اُنگلیاں اس کے بالوں میں اسی طرح حرکت کئے جائیں۔

زمرّد کو بچے کی شادی کا بڑا ارمان تھا۔ اس کا بس چلتا تو ان گنے برس ہی گھر میں بہولے آتی اور اَب تو جب سے خدا رکھے اس کی مسیں بھیگی تھیں اور مونچھوں کے کونڈے ہوئے تھے وہ گھڑی کی چوتھائی میں اپنا یہ ارمان نکال لینا چاہتی تھی۔ زندگی کا کیسا بھروسہ۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ آخر میر محمد علی بے چارے حسرت ہی لے گئے نا۔ بہت دن تو وہ اپنی چھکڑا سی زندگی بیٹے کے سر سہرا دیکھنے کے لئے گھسیٹتے رہے پھر ایک دِن ٹیں ہوگئے۔ اور زمرد کو یوں لگا جیسے اِس کی بھی دھک دھک کرتی ڈبیا اب

بہت جلد بند ہو جائے گی۔ یوں تو بے چارے میر صاحب تھے کس گنوت کے۔ ان کا ہونا نہ ہونا برابر تھا مگر سر کا سہرا قائم تھا تو زمرّد کے دل کو ڈھارس بندھی تھی ان کے بعد تو وہ بتاشے کی طرح بیٹھنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے بھنورا سے بال تل چاؤلے ہو گئے۔

بیاہ کرنے اٹھی تو زمرد نے سارا شہر چھان مارا۔ جسے دیکھتی ناک بھوں چڑھا کے چھوڑ دیتی تھی۔ ماشا اللہ خود بڑھاپے میں ایسی تھی کہ آدمی دیکھے تو دیکھتا رہ جائے پھر بھلا ایسی ویسی کب اس کی نگاہ پہ چڑھ سکتی تھی۔ کوئی ناک نقشے کی اچھی ہوتی تو اس کا رنگ گھٹا ہوتا، کسی کی رنگت صاف ہوتی تو نقوش موٹے موٹے، تھوا کے تھوا۔ اور قد میں تو سب مار کھاتی تھیں۔ جسے دیکھئے چبوترہ کی چبوترہ چولائی کی طرح چوڑان میں پھیل گئی ہے۔ زمرّد کو اچھی طرح یاد تھا خوشنودی جان کہتی تھیں، موٹی ٹھگنی اور موٹی عورت سے مرد نکاح کرے تو سہرے کے بجائے سر سے کفن باندھے اور خوشنودی کا تجربہ کوئی معمولی تجربہ تو تھا نہیں اسی لئے زمرّد نے گرہ میں باندھ لیا تھا کہ بہو لائے گی تو لانبے قد اور اکہرے بدن کی لائے گی جو چلے تو پھلواکی ڈالی کی طرح لچک لچک جائے اور ناک نقشہ ستوان، خوب کھڑا کھڑا تصویر کی مانند ہو۔

مثل مشہور ہے کہ ڈھونڈے سے تو انسان کو خدا بھی مل جاتا ہے۔ زمرّد نے جوتیاں توڑیں تو آخر ایک دن بہو تلاش کر ہی لی۔ خوب دھوم دھام سے شادی کی۔ مائیوں کے دن سے جو مہمانداری ہوئی تو کسی نے جانے کا نام نہ لیا۔ بری اور چڑھاوا بھی اتنا دیا کہ جو دیکھتا آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی تھیں۔ دُہرا دہرا تو زیور تھا۔ ایک کندن کا ایک سادے کاری جڑاؤ۔ پور پور کے لئے چھلا، انگوٹھی۔ جوڑے ایسے تلواں کہ گوندنی کی طرح لدے پڑے تھے۔

رخصت ہو کے بہو گھر آئی تو سیاہ بکرا ذبح کر کے انگلی کو خون لگایا پھر دودھ سے پاؤں دُھلائے اور زمرّد اپنی گود میں اٹھا کے اندر لائی ان گنت روپیہ نیگ میں دیا۔ اشرفیاں سر سے چھوا کے صدقے کیں۔ غرض جی بھر کے ارمان نکالے۔ خدا رکھے

کسی بات کی کمی تو تھی نہیں جو ہاتھ رکتا۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا۔
دوسرے دن سمدھنیں دُلہن کو لینے آئیں تو آپس میں خوب ہنسی ٹھٹھے ہوئے۔ نوک جھونک چلتی رہی۔ زمرّد نے ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ وہ بھی خوب جوبن دکھلاتیاں اہلی گہلی پھراکیں پھر چادر دھلائی کی رسم ہوئی تو یکایک سمدھنوں کے منہ اُتر گئے۔ خدا جانے ساتھ والی پیاروں بیٹی نے کیا صور پھونکا کہ ساری محفل کا رنگ ہی بدل گیا آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہونے لگے اور ایسی تناتنی ہوئی کہ آمنے سامنے بیٹھنا دشوار ہو گیا۔ آخر دُلہن والوں میں سے ایک عورت اُٹھ پٹاری کے پاس گئی اور لگنی سے پکا سا پان کھینچ ہتھیلی پہ رکھ کے دُولہا کی ماں کے سامنے مسل دیا۔
کچھ دیر بعد زمرد کے گھر سے بہو کی ڈولی ہمیشہ کے لئے واپس جا رہی تھی۔

ڈائن

سن لائٹ بلڈنگ میں سب سے پہلے لچھمی بیدار ہوتی ہے۔ اس کا شرابی شوہر رات بھر اسے جھنجھوڑنے اور خوب ستانے کے بعد پو پھٹتے وقت اونگھنے لگتا ہے علی الصبح اس کی رگ رگ میں تشنج کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ دیسی شراب اور لچھمی کا سوکھا سہما بدن اسے اکتا دینے والی حد تک تھکا دیتے ہیں اور جب یہ دونوں لستے لوٹتے ہیں تو وہ کوڑیالے سانپ کی طرح کنڈلی مارے کمرے کے ایک کونے میں ناریل کی چٹائی پر بے سدھ سا پڑ جاتا ہے۔ اس وقت لچھمی اپنی ساری کا پلو درست کرتی ہے چولی کی کواڑیاں ٹھیک سے پسلیوں کے پنجر پر منڈتی ہے اور چھوٹے چھوٹے نرم پستانوں کو ان کے بیچ منی پرس کی طرح یوں چھپا کر رکھتی ہے جیسے وہ اس کی عمر بھر کا سرمایہ ہوں۔ اس کے جسم پر ان دو لوتھڑوں کے علاوہ کہیں گوشت نہیں ہے۔ دمے کے موذی مرض اور سنکھیا کے مسلسل استعمال نے اس بے چاری کو ببول کے پیڑ کی طرح سکھا دیا ہے وہ صحرا کے ریت کی طرح ہر وقت تپتی رہتی ہے اور شاید اسی تپش پر اس کی زندگی کا مدار ہے۔ اس کا مرد بڑا ظالم ہے۔ کام کاج کچھ نہیں کرتا۔ اب کا سویا دن کو دو ڈھائی بجے اُٹھے گا۔ لچھمی جو کچھ بلڈنگ کے ججمانوں سے بٹور کر لائے گی، بھوکے بھیڑیے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے گا۔ پھر جب کھانے سے سیر ہو جائیگا تو تھوڑی سی شنگرف منہ میں ڈالے گا اور تب ہی اس کے لئے دن نکلے گا۔ اس کے بعد وہ بلڈنگ کے باہر ادھر اُدھر آوارہ گردی کے لئے نکل جائیگا یا پھر کسی بات پر دھوادھوں سوکھے دھان جیسی لچھمی کو خوب کوٹنے لگے گا۔ ساری بلڈنگ والے اس تماشے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اب ان میں سے کوئی پلٹ کر بھی نہیں دیکھنا چاہے وہ اس مردہ مال غریب عورت کا دم ہی کیوں نہ نکال دے۔

لچھمی سارا دن صاحب لوگوں کی ٹہلے نویسی کرتی ہے۔ ایک بولی دس کام بھرکی کی طرح گھومتی رہتی ہے۔ لچھمی بچوں کے اسکول کا کھانا تیار کردو، لچھمی صاحب کے لئے چائے لاؤ، لچھمی ڈرائنگ روم کا فرنیچر صاف کرو، لچھمی ذرا پنکھا کھول دو لچھمی پانی لاؤ، لچھمی یہ کرو، لچھمی وہ کرو۔ دِن بھر میں سینکڑوں مرتبہ تو اسے دروازہ کھولنا پڑتا ہے۔ صبح دودھ والے سے لے کر دوپہر کی ترکاری تک بیسیوں سودے والے آتے ہیں اور لچھمی ہر ایک کا سودا سنبھال کر اس کا حساب کتاب کرتی ہے۔ پکاتی ریندھتی ہے، مہمانوں کے لئے چائے بناتی ہے۔ فریج میں پانی اور کوکا کولا کی بوتلیں ٹھنڈی ہونے کے لئے رکھتی رہے۔ آنے جانے والوں کی خاطر مدارات کے لئے نکال نکال کر دیتی ہے۔ دوپہر کو کھانے کی ٹیبل پر دو تین سالن اور ڈھیر سارے پھلکے پکا کر رکھتی ہے۔ شام کو ناشتہ تیار کرتی ہے پھر رات کا کھانا کھلاتی ہے۔ بچوں کو سلاتی ہے اور جب ان کاموں سے فارغ ہوتی ہے تو میلے کپڑے لے کر غسل خانے میں گھس جاتی ہے۔ وہاں سے نکلتی ہے تو باورچی خانے کی صفائی کرتی ہے فرش کا پوچھا لگاتی ہے اور آخر میں واش بیسن اور غسل خانے کی صفائی کر کے مٹھی بھر چاول اور بچا کچھا کھانا لے کر اپنے کوارٹر میں جاتی ہے تو وہاں اس کا مرد شراب کے نشے میں دُھت اس کا انتظار کرتا ملتا ہے۔ وہ اپنی بدمستیوں میں رات کے پچھلے پہر تک اسے ایک پل کے لئے سونے نہیں دیتا۔ بے چاری کی نیند بالکل اڑ گئی ہے۔ شوہر سے ملنے کے بعد ذرا دیر کے لئے آنکھوں میں جو خمار کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور پپوٹے بھاری ہو جاتے ہیں اسی میں وہ ہنڈولے کی طرح جھول کر پھر سے تروتازہ دکھائی دینے لگتی ہے بڑی صبر کی بندی ہے۔ کبھی کسی سے شکوہ نہیں کرتی۔ زندگی کی جو تھوڑی بہت لذت اسے مردکی قربت سے حاصل ہوتی ہے وہ اس کے جینے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے وہ اپنی تمام محرومیوں کے باوجود مطمین اور خوش وخرم دکھائی دیتی ہے۔ لچھمی جیسی ہزاروں لاکھوں عورتیں بمبئی کی اس گہما گہمی میں اسی طرح اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی ہیں اس لئے لچھمی کو یہ سب ٹھیک ہی لگتا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ وہ اسی لئے پیدا کی گئی ہے۔ بیمار پڑتی ہے تو اس کے حلق میں جلدی جلدی تیز دوائیں اتار دی جاتی ہیں کچھ ان دواؤں کے اثر سے

اور کچھ مالکوں کی گھبراہٹ سے اسے جلدی ہی کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ سچ پوچھیے تو لچھمی کو بیمار ہونے ہی کے لئے نہیں، مرنے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ اگر وہ مرگئی تو دن بھر کولہو کے بیل کی طرح یہ سارے کام کون کرے گا اور رات کو اس کے مسٹنڈے شوہر سے اپنی ہڈیاں چچڑوانے کون آئے گا۔ بس اسی لئے وہ جی رہی ہے۔ دمے کی گولیاں کھا کھا کے، بلغم تھوک تھوک کے پرانے ڈھول کی آواز میں خوب کھانس کھانس کے، کچھوے کی طرح ہانپ ہانپ کے اور جنگلی کبوتر کی طرح ہنکارے بھر کے وہ سانس کی ڈوری کو سنبھالے ہوئے ہے۔

لچھمی کے ہاں بچہ نہیں ہوتا۔ اس کے مرد میں کچھ خرابی ہے۔ شنگرف کھا کھا کے وہ لچھمی کی چولیں تو ہلا دیتا ہے لیکن گود بھرنے کی بات اس کے بس سے باہر ہے شادی سے پہلے اسے گرمی ہو گئی تھی۔ سارا خون کالا پڑ گیا تھا۔ بدن پر لولا بتا سا جیسے آبلے پڑ گئے دوائی ٹھنڈائی سے ٹھیک تو ہو گیا مگر اس گرمی نے اس کی آئندہ نسل کو بھسم کر دیا تھا سب کچھ جل کے خاک ہو گیا اور بدن میں ہر گھڑی لاوا سا گردش کرنے لگا۔ لچھمی اس جوالا مکھی پر بیٹھی زندگی کے دن ہنسی خوشی کاٹ رہی تھی ——— اسے اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ بچوں کی تمنا کرے۔ کبھی کبھار دل میں ہوک اٹھتی تو وہ بلڈنگ کے کسی بچے کو گود میں لے کر گھڑی دو گھڑی ہلکورے دے لیتی تھی۔ اسکا دل ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ اپنے نہ سہی بلڈنگ والوں کے بہتیرے بچے ہیں۔ یہ تسلی اس کے لئے کافی تھی۔ بہت دن ہوئے جب صاحب نے کرارے سے پانچ روپیہ کے نوٹ کیساتھ اسے ایک امانت بھی سونپی تھی تو وہ چار مہینے تک چپکی اسے سنبھالے بیٹھی رہی البتہ جب صاحب کو معلوم ہوا تو وہ بہت خفا ہوئے اور غصہ میں آکر پہلے لچھمی کو برا بھلا کہا پھر بٹوے سے پچاس روپے نکال کر دئے کہ وہ کسی دائی جنائی کی مدد سے اس ننھی کونپل کو سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دے۔ آخر اس نے ایسا ہی کیا اور پھر بیٹھ کر ٹسر ٹسر رونے لگی۔ اسے یہ محسوس ہوا کہ اس نے ناگن کی طرح اپنے آپ کو ڈس لیا ہے اور بھائیں بھائیں کرتے اپنے ویران پیٹ میں اسے کئی دن تک رونے پیٹنے کی صدائیں آتی

رہیں ۔ لچھمی کو آج بھی جب وہ بات یاد آتی ہے تو وہ ساڑی کے پلّو سے اپنی ناک پونچھ کر سُرخ کرلیتی ہے لیکن مجال نہیں کہ آنکھ سے ذرا سا بھی پانی ٹپک جائے ۔ اپنے آپ سے زیادہ اسے اس گھر کی عزّت کا خیال ہے ، وہ جس کا نمک کھاتی ہے اسے بدنام نہیں کر سکتی ۔ صاحب تو اب اس کی طرف آنکھ اُٹھا کے دیکھتے بھی نہیں ۔ خدا جانے اتنی پرانی بات یاد بھی رہی یا بھول گئے مگر لچھمی جب بھی انہیں دیکھتی تھی تو من ہی من میں ان کی آرتی اُتار لیتی تھی ۔ اسے اپنی مالکن سے بس ایک ہی شکایت ہے کہ وہ صاحب کو سویرے شام جب چاہتی ہے خوار کردیتی ہے ۔ بھگوان اسے شکتی دے تو وہ مالکن کی زبان جلتے ہوئے زنبور سے پکڑ کر کھینچ لے اور بتائے کہ مرد ذات کا اپمان کرنا اس کے نزدیک کتنا بڑا پاپ ہے وہ کڑھتی ہے سلگتی ہے پر اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتی ہے ۔ ٹکے کی نوکرانی ہی تو ہے ۔ اُترن پہنتی ہے ، جھوٹا کھاتی ہے ۔ صاحب بی بی کے معاملے میں بولنے کا اسے کیا حق ہے ، جو حق ہے اسے جتائے گی تو اگنی پریکشا لوٹ جائے گی ۔ کچی مٹی کا گھروندا جس میں وہ اور اس کے مالک رہتے ہیں اڑاڑا دھم کر کے زمیں پر آگرے گا ۔

مالتی دیوی گھر کی مالکن ہیں ۔ انہوں نے کبھی سورج نکلتے ہوئے نہیں دیکھا دن چڑھے بستر چھوڑتی ہیں پھر بھی ان کے انگ انگ میں تھکن سی بھری دکھائی دیتی ہے لچھمی کی طرح ہلکی پھلکی نہیں ہوتیں ۔ گیارہ بجے غسل خانے میں گرم پانی اور ولایتی صابن سے اپنے چمکدار سیاہ جسم کو خوب مل مل کے دھوتی ہیں ۔ خوشبو کا سیلاب لئے باہر نکلتی ہیں ۔ تولیے سے خشک کر کے ہیر ڈرائی لگا بالوں کی جڑیں رنگتی ہیں ۔ طرح طرح کے لوشن ، کریم اور پوڈر سے اپنی جلد کو نکھارتی ہیں ۔ گہرے سُرخ رنگ کی لپ اسٹک سے ہونٹوں کو سجاتی ہیں اور چہچہاتے رنگ کی ساڑھی پہن نیپالی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی ، گھر سے نکل جاتی ہیں ۔ پھر وہ کوئی دو گھنٹے بعد اپنی بہت سی سہیلیوں کو موٹر میں بٹھائے گھر لوٹتی ہیں ۔ سب سے پہلے کھانا کھاتی ہیں اور اس کے بعد ایک علیحدہ کمرے میں بیضوی ٹیبل پر تاش کی جوڑیاں اور پلاسٹک کے ٹوکنوں سے بنے دو دو سو روپے کے بنک تیار ملتے ہیں ۔ کمرے میں ٹیبل کے بیچوں بیچ ایک بڑا سا بلب دن رات جلتا رہتا ہے ۔

اور ہلکی ہلکی آواز دیتا ہوا پنکھا ان کے سروں پر یوں گھومتا رہتا ہے جیسے زمین اپنے محور پر چکر کاٹ رہی ہو۔ پلاسٹک کے لوڈکن شطرنج کے مہروں کی طرح آگے پیچھے گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اس گردش سے مالتی اور اس کی سہیلیوں کے چہروں کے رنگ میں تغیر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ کبھی کوئی اونچی آواز میں یوں چیخنے لگتی ہے جیسے چماروں کی بستی میں نند بھاوجیں لڑتی ہوں۔ کسی کو بار بار اٹھ کے باتھ روم جانا پڑتا ہے کوئی خرگوش کی کھال سے بنے پرس سے پانچ سوپچپن کا سگرٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیتی ہے اور کسی کے لئے کبھی کو آڑا ماچس گلاس کے ساتھ رکھ کے اس کی ناپ کا ایک چھوٹا پیگ بنانا پڑتا ہے۔ دیوار پر لگے الکٹرک کلاک کی سوئی گھومتی رہتی ہے۔ تاش کی جوڑیوں کا جوان جسم گھستے گھستے ملت ہو جاتا ہے۔ نیلے آسمان کا مسافر کھڑکی سے نظر آنے والے فاصلے کے آغوش میں منہ ڈھانپ کے سو جاتا ہے۔ دور کہیں سے کتوں کے رونے کی صدائیں آتی ہیں تو کبھی بیٹھی سوچتی رہتی ہے کہ اس کے مرد کا نشہ اب جوان ہو گیا ہوگا۔

ٹیبل کے اس طرف جہاں بنک کا کبورڈ، دو دیواروں کے بیچ ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ اندو بیٹھی ہے۔ یہ کسی بڑے بزنس مین کی بیوی ہے۔ شوہر نے پچھلے چودہ سال سے اس کے جسم کو چھوا تک نہیں ہے اسے اپنے کاروبار سے فرصت ہی نہیں ملتی اور جب ملتی ہے تو اندو ہاتھ نہیں آتی۔ ہوٹل میں ناؤ نوش کے بعد اگر جی چاہتا ہے تو کسی انجان حسینہ کو بلا کے گھڑی دو گھڑی عیش کر لیتا ہے۔ اندو کا جسم اب شام کے سورج کی طرح ڈھلنے لگا ہے البتہ وہ اسے چست کپڑوں اور اسکارف کی مدد سے یوں کس لیتی ہے کہ اچھا بھلا آدمی دھوکا کھا جائے اس کے بال بھونرے کی طرح سیاہ ہیں، ممکن ہیں رنگے ہوئے ہوں لیکن کوئی پہچان نہیں سکتا۔ ولایتی ڈائی لگاتی ہوگی۔ وہ خوب شراب پیتی ہے۔ تاش کھیلنا اسکی ہابی ہے۔ شادی کے وقت ان دونوں باتوں کا ذکر اس نے اپنے شوہر سے بھی کر دیا تھا۔ اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ پھر جب دو بچوں کے بعد اس نے شوہر سے الگ سونا شروع کیا تو شوہر نے اس کی وجہ دریافت کرنا ضروری نہیں سمجھی۔ اندو کہتی ہے ہر مرد کچھ دن بعد ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ وسکی کے نشے کی طرح، عورت کو چاہیئے کہ وہ کسی ایک

کی جاگیر بن کے نہ رہے ۔ ادل بدل کرتی رہے ۔ اسے وولٹیج کی تلاش ہے ۔ ہائی وولٹیج کی ۔ اسی لئے وہ خالی وقت میں موٹر نکال سڑک پر بجلی کے کھمبوں سے ٹکراتی پھرتی ہے ۔ جہاں اسے تگڑا شاک لگتا ہے وہیں گھڑی دو گھڑی بیٹھ کے اس کا مزا لیتی ہے ۔ پھر جب یہ برقی رو اس کی سوندھی سوندھی پیاسی مٹی میں دنادن اتر جاتی ہے تو ایک سرشاری کے عالم میں گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ ایکسیلیریٹر پورے زور سے دبا دیتی ہے کئی بار تو بونٹ کا ڈھکنا اٹھ کر ونڈ اسکرین سے آن لگا ۔ آگے کچھ دکھائی نہیں دیا مگر اندوا ایکسیڈنٹ سے ڈرنے کی بجائے اچانک مرنے کی تمنا کرتی ہے گاڑی بھگائے لئے جاتی ہے ۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے ۔ اندوہ تاش کے پتے ، بن باس دیا ہوا شوہر بزنس کی اندھی آمدنی ، شراب کے کڑوے گھونٹ ، سگریٹ کا میٹھا دھواں ، کولتار کی لمبی سڑک سے چپکی ہوئی مرسڈیز گاڑی اور ہائی ٹینشن وائر لگے شاک مارتے ہوئے بجلی کے کھمبے ۔

دوسری عورت اوپر سے نیچے تک پھولدار میکسی میں بند گوندی ہے ۔ اس کے کئی دھندے ہیں ۔ مٹکا لگاتی ہے ۔ لڑکیاں سپلائی کرتی ہے ۔ شراب کی بھٹیوں میں ساجھا ہے ۔ تھوڑا بہت اسمگلنگ کا کام ہے ۔ روپیہ اس کے آگے پیچھے پھرتا ہے ۔ اسے تھائرائڈ کے غدودوں کا مرض ہے ، غصہ بہت آتا ہے ۔ جسم نانبائی کے خمیری آٹے کی طرح پھیل گیا ہے ۔ چار فٹ چوڑے ورانڈے سے گذر کر آتی ہے تو دونوں سائڈیں دیوار کو چھونے لگتی ہیں ۔ اسے دو کرسیاں ملا کر بیٹھنا پڑتا ہے ۔ ڈرائیو کرتی ہے تو آگے کی سیٹ پر اس کے ساتھ اور کوئی نہیں بیٹھ سکتا ۔ ہارمونز کی گولیاں لیتی ہے اس لئے دماغی خلیئے شرارت سے باز نہیں آتے ۔ جلدی گرم اور دیر میں ٹھنڈی ہوتی ہے ۔ پیسے کے بل پہ جب جی چاہتا ہے چھوکرے پکڑ لاتی ہے ۔ انہیں گالیاں بکتی ہے تھپڑ مارتی ہے ، کپڑے نوچ لیتی ہے اور پھر لاتیں مار مار کے گھر سے نکال دیتی ہے ۔ حرامی پلوں دہلیز کے چاٹنے والوں ، نامرد ، سور کی اولاد میں کوئی بچے جننے کے شوق میں تمہیں پکڑ کے لاتی ہوں ، دفع ہو جاؤ یہاں سے اس کے اندر لاوا پکتا رہتا ہے ۔ آگ سلگتی رہتی ہے ۔ تھائی رائڈ نے اندر سے ٹھنڈا کر رکھا ہے ۔ برف کے تودے کی طرح اور ہارمونز کی

گولیاں باہر سے پھونکے ڈالتی ہیں ۔ ٹھنڈا گرم ، گرم ٹھنڈا ۔ پورا وجود ایک رزم گاہ بن گیا ہے جو اسے ہر وقت توڑتا مروڑتا رہتا ہے ۔ گوندی ریزہ ریزہ ہو گئی ہے ۔ وہ چاہتی ہے کہ ایسی چنگاری ملے جو اس کے اندر کی برف کو پگھلائے بلکہ یوں کہیے کہ شعلہ بنا دے گوندی کا پرس روپوں سے ٹھسا ٹھس بھرا رہتا ہے ۔ وہ جیتتی ہے تو پانچ دس روپے پچھی کو بھی انعام دے جاتی ہے ۔ ایسے موقعوں پر وہ آنکھ بند کر کے پچھی کے سینے پر دو ہتڑ بھی جما دیتی ہے اور آپ ہی آپ ہنسنے لگتی ہے اس نے پچھی کو کئی بار سمجھایا کہ وہ اس ستیا ناسی کے بیج مرد کو چھوڑ دے ۔ اِدھر اُدھر کہیں سے اپنی کو کھ ہری کرا لے سورج کی آخری کرن سے سورج کی پہلی کرن تک ایک رات میں اس کی دنیا بدل سکتی ہے یوں نامراد پھرتی رہے گی تو سوکھ سوکھ کے کانٹا ہو جائے گی مگر پچھی ہے کہ سنتی ہی نہیں ہے ۔ اسے کہاں فرصت دھری ہے کہ گوندی کی طرح شہر بھر کی خاک چھانتی پھرے ۔ بھگوان بھلا کرے ماں باپ کا ۔ انہوں نے اچھا بُرا جو کچھ بھی ہے ایک مرد تو پلے سے باندھ دیا دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد رات کو کھٹیا پہ اکیلے تو نہیں لیٹنا پڑتا پہلو میں گرم گرم تپتا ہوا جسم ہوتا ہے ۔ ایسا جسم جس پر اس کا اجارہ ہے ۔ جو رات کے پچھلے پہر تک اس کے انتظار میں سلگتا رہتا ہے گوندی کیا جانے کہ عورت اپنے مرد کو پورب کی جادوگرنیوں کی طرح ہیرامن طوطا بنا کر اپنے دل کے پنجرے میں کیوں بند کر لینا چاہتی ہے اسکا تو عورت پن مر گیا ہے ۔ سارا شریر مردہ گوشت کی طرح لڑھکتا پھرتا ہے بھینس کی سی موٹی کھال جس پہ ہاتھ لگائیے سے پچپچاہٹ ہوتی ہے ، بے جان دکھائی دیتی ہے پچھی کا اپنا جسم کیسا ہی پتلا دبلا اور کمزور سہی مگر روئیں روئیں اور نس نس میں جھرجھری تو آتی ہے ، یہ سوچتے ہی اس کے مسام کھلنے لگے اور یہ محسوس ہوا کہ ڈھلتی رات نے اسے اپنی باہوں میں جکڑ لیا ہے کھنکھجورے کی طرح

پشپا اور لتا گوندی سے اگلی دو کرسیوں پر بیٹھی ہیں ۔ ان کا بنک مشترک ہوتا ہے ایک دوسرے کے پتے بھی دیکھ لیتی ہیں ، مشترک بورڈ ڈالتی ہیں ۔ بلائنڈ چال ہوتی ہے تو دونوں میں سے ایک پتے پھینک دیتی ہے ۔ پشپا بڑی لکی ہے ، خوب جیتتی ہے اور

اور لتا اس کے قریب بیٹھی رہتی ہے جیسے کوئی گرہستن اپنے میاں کے کولہے سے لگی بیٹھی ہو۔ لتا نازک اندام اور شرمیلی سی عورت ہے۔ اس کی نشیلی انکھڑیاں ہر وقت پشپا کے تمتماتے ہوئے رخساروں پر جمی رہتی ہیں۔ سرجھول جھول کے پشپا کے سڈول بازوؤں کی مچھلیوں سے ٹکراتا ہے۔ پشپا اور لتا دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ ساتھ کھیلتی ہیں۔ ساتھ ہنستی ہیں۔ ساتھ بولتی ہیں۔ ساتھ کھاتی ہیں۔ ساتھ پیتی ہیں اور ساتھ سوتی ہیں۔ ایک پلنگ پر چھپکلی کے جوڑے کی طرح ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی پشپا کا پرس خالی ہو جاتا ہے تو وہ کہتی ہے لتا تو اٹھ جا اور لتا بجلی کی سرعت کے ساتھ کھڑی ہو جاتی ہے۔ البتہ لتا کا موڈ نہ ہو تو بھی پشپا اسے اپنی ایک نظر میں ساری عمر بیٹھنے پر راضی کر لیتی ہے پشپا اور لتا شادی سے پہلے کی دوست ہیں۔ دونوں لیڈی اروِن میڈیکل کالج میں ایک ساتھ پڑھا کرتی تھیں، ہوسٹل کی لڑکیوں میں طرح طرح کی رقابتیں ہوتی ہیں۔ اندر ہی اندر کھینچا تانی چلتی رہتی ہے لتا آٹھ نمبر کمرے میں کسی کی پارٹنر تھی۔ پشپا کا نہ جانے کیوں جی چاہا کہ وہ لتا کے ساتھ رہے۔ لتا کو بھی پشپا کی یہ تجویز پسند آئی۔ اتفاق سے وارڈن نے بھی لتا کو پشپا کے کمرے میں بھیجنے کی منظوری دیدی۔ دونوں پانچ چھ برس ساتھ رہیں۔ ڈاکٹری کے امتحان پاس کئے۔ ایک ہی ہسپتال میں ہاؤس جاب کیا اور اب عدت سے ایک ساتھ پریکٹس کر رہی ہیں۔ شادی کی تو چار دن تک چڑیوں کی طرح چونچ لال کر کے زمین پر رگڑ دی۔ ایک کا شوہر ملازمت کے واسطے پر انگلستان چلا گیا اور دوسری کا شوہر کافی عرصے میل ملاپ کی کوشش کرتے کرتے اب تھک کر بیٹھ گیا ہے۔ لتا آج کل مرد کے نام سے چڑتی ہے اس کے شوہر کا کبھی کوئی بھولے سے ذکر بھی کر دیتا ہے تو محفل سے اُٹھ کر پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی جاتی ہے۔ اس معاملے میں پشپا بھی بڑی ایگریسو ہے۔ کچھ بھروسہ نہیں۔ کیا پتہ ذکر کرنے والوں کو مار بیٹھے۔ ایک دن ان کی گاڑی کے پیچھے کسی نے گاڑی لگا دی۔ لتا تو ذرا گھبرا گئی۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگی۔ مگر پشپا نے جھٹ گاڑی روک کر ایک گندی سی گالی دی اور ہاتھ سے کچھ بے ہودہ اشارہ کیا۔ پیچھا کرنے والے جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی لوٹ گئے۔

دمینتی اپنے ہونٹوں کا شگوفہ بنائے لالی پپ چوس رہی ہے اسکے گالوں
میں ہنستے وقت گڑھا پڑتا ہے۔ سنا ہے ایسی عورت اپنی ساس کی زندگی پر بھاری پڑتی
ہے مگر دمینتی تو سارے گھر کو کھا گئی۔ اسے یہ پسند نہیں کہ اس کے مرد پر اس کے علاوہ کسی
اور کی بھی ذمہ داری ہو۔ شوہر کو لوٹ کر پیار کرتی ہے اور اس کا جواب بھی اسی انداز سے
چاہتی ہے۔ میں اور میرا اپنا باقی سب رونا۔ بیاہ کر آئی تو سسرال میں بھرا کنبہ دیکھا۔ رات
دن میں کوئی وقت ایسا نہ ملتا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے دل کھول کر بات کر لیتی۔ اندر ہی
اندر گھٹتی رہتی اس کا جی چاہتا تھا کہ سمندر کے اس پار ریت کی چٹانوں میں ایک لمبا چوڑا
محل بنائے اور اس محل کے نیچے اپنے شوہر کے ہمراہ چاندنی میں نہاتی رہے۔ اسکی پلکیں
لمبی اور آنکھیں خواب آور تھیں۔ ناک کی چونچ یوں ہونٹوں پر جھک گئی تھی جیسے ان سے
سرگوشیاں کرتی ہو۔ بدن لانبا اور متناسب تھا۔ جلد اتنی ملائم تھی جیسے گلاب کی پتیاں
اس پر کہیں کہیں سنہرا رواں مخمل پر مقیش کے تاروں کی طرح بکھرا ہوا تھا۔ دمینتی کا شوہر
الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کرتا تھا۔ اس کا تعلق تعزیرات ہند سے اتنا گہرا تھا کہ
زندگی کے نرم گوشوں پر توجہ کم ہی جاتی تھی۔ دمینتی ساس، نند، دیور، دیورانیوں، جیٹھ
جٹھانیوں میں اس طرح گھر گئی تھی جیسے سیتا کو راکھشسوں نے گھیر لیا تھا، اس نے کچھ
عرصے حالات کا جائزہ لیا پھر انتظار کرتی رہی اور جب انتظار کرتے کرتے اکتا گئی تو
بمبئی چلی آئی۔ اب وہ فلم انڈسٹری میں رقاصہ کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ خوب کماتی
ہے، خوب اُڑاتی ہے۔ سمندر کے کنارے محل تو نہ بن سکا البتہ کیمرے کی گرم گرم روشنی میں
نت نئے شہزادوں کے ساتھ سنجوگ روز ہوتا ہے۔ بوٹی بوٹی تھرکتی ہے اور جب اس کے نیم عریاں
جسم پر رنگین شعاعیں پڑتی ہیں تو فضا میں چاروں طرف قوس قزح کے رنگ بکھر جاتے ہیں۔

بمبئی شہر آدمیوں کا ایک ایسا جنگل ہے جس میں سب ایک دوسرے کے ساتھ چل رہے
ہیں۔ ستاروں کی مانند اپنے اپنے راستے پر اسی لئے ٹکراتے اور ٹوٹتے نہیں

چھ نمبر کے فلیٹ میں انبالے کی ایک طوائف رہتی ہے۔ دن رات مجرا ہوتا ہے
باہر بیگم سبزواری کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ پانچ نمبر کے فلیٹ میں اکتالیس لڑکیاں ہیں اور ایک

مرد۔ انڈے مرغی کا کاروبار ہو رہا ہے۔ اکیس نمبر کے فلیٹ میں دیسی شراب بکتی ہے اور سترہ نمبر فلیٹ کے ایک کمرے میں یہ پانچوں عورتیں مالتی اور لچھمی بیٹھی ہیں۔ کسی کو کسی کا پتہ نہیں۔ دروازے پر بیل ہوتی ہے تو لچھمی اُٹھ کر پہلے ایک آنکھ بند کر کے ننھے سے سوراخ سے باہر جھانکتی ہے۔ پھر اگر دروازے پر کھڑا آدمی جانا پہچانا ہوتا ہے تو کواڑ کھول دیتی ہے۔ ورنہ زنجیر لگا کے وہیں کھُسر پھُسر باتیں کر کے اسے باہر کے باہر ہی ٹال دیتی ہے۔

گوونڈی کہتی ہے مالتی تو بھی اب آزاد ہو جا چھوڑ اس مٹی کے مادھو خصم کو ذرا بمبئی کی سیر کر یہاں بھانت بھانت کا جالور آتا ہے۔ مالتی جھینپ جاتی ہے۔ اس نیک مشورے اور گوونڈی کے خلوص پر سنجیدگی سے غور کرنے لگتی ہے۔ لچھمی کو یہ بات بری لگی پر کچھ کہتی بھی تو بھلا اس کی سنتا کون۔ اندو نے کہا "نہیں ری ایسا کیوں بولتی ہے مالتی کا ہسبنڈ کام کرتا ہے" گوونڈی نے اندو کی ران پر زور سے ہاتھ مارا اور ایک آنکھ میچ کر کہنے لگی کام کرنے والا چھوکرا ہم بہت پکڑ کر لا دے گا جب چاہے بدل دے۔" پشپا اور لتا دونوں خاموش بیٹھی سن رہی تھیں لتا نے کہا گوونڈی آنٹی تم پہ چھوکرا لوگ مرجاتا ہے۔ گوونڈی نے آنٹی کے کہنے پر لتا کو ایک موٹی سی گالی دی اور اُٹھ کر مٹک مٹک کے چلتی ہوئی پہلے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا جب مطمئن ہو گئی تو کہنے لگی۔ چل تو اور میں ساتھ چلتے ہیں پھر دیکھ بمبئی کے چھوکرے کیسے دیکھتے ہیں، پگلی یہ بھی ایک آرٹ ہے ایکٹنگ، پینٹنگ اور ماڈلنگ کے موافق پھر وہ واپس آ کے اپنی کرسی پر بیٹھی تو اس کے کولہے ایک ایک بالشت کرسی سے باہر نکل گئے اور اندو کے گھٹنوں سے ٹکرانے لگے۔ اندو نے ہاتھ بڑھا کے چٹکی لینے کی کوشش کی مگر وہ کھسیا کے رہ گئی۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ لچھمی نے ریسیور اُٹھا کر کانوں سے لگایا اور وہیں سے چیخی "میم صاحب گوندی کا فون ہے۔" گوندی بڑے ٹھسے سے اُٹھی۔ ساڑی کی شکنیں درست کیں۔ بالوں میں انگلیوں سے شانہ کیا اور اٹھلاتی ہوئی فون پر یوں بات کرنے لگی جیسے بولنے والا اس کے سامنے بیٹھا ہو۔ بات ختم ہوئی تو واپس میز تک آئی۔ مالتی

پرس سے ڈریسنگ ٹیبل کی چابیاں لیں، تولیہ نکالا، غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں سے پرفیوم نکال کر اپنے جسم کے ہر حصے کو خوشبو میں بسانے لگی۔ مالتی کے وارڈروب سے بنارسی ساڑھی نکال کر باندھی اور چوتھی کی دُلہن بن کے اپنا سگریٹ کیس، چاندی کی جیبی بوتل سمیٹی۔ میز کے کونے پر بکھرے ہوئے چُرمُر سے نوٹ اٹھا کر پرس میں ٹھونسے اور مالتی کے کندھوں کو جھنجھوڑ کر کہنے لگی۔ اچھا بھئی چلتے ہیں ہمیں تو تلوار صاحب نے بلایا ہے۔ ذرا ان کی دھار دیکھیں گے، اندو نے کہا "بڑی موٹی مرغی ہے، کاٹنے کے یہاں لے آئیو"، گوونِدی ہنسنے لگی۔ مالتی نے ایک نگاہ سے اپنے تئیں جائزہ لیا۔ آنکھیں نیند کے بوجھ سے جھکی جاتی تھیں اور ان میں سرخ سرخ ڈورے کھنچ گئے تھے۔ چہرہ بھرا بھرایا ہوا سا لگتا تھا۔ ہونٹوں پر صبح کی لگی لپ اسٹک دھندلائے لاکھے کی طرح سیاہی مائل ہو گئی تھی۔ بال ذرا پریشان تھے اور یہ پریشانی بھلی دکھائی دیتی تھی، جسم پر ہمیشہ کی سی تھکن سوار تھی اسکا جی چاہ رہا تھا کہ اسے پکڑ کر کوئی اتنے زور سے بھینچے کہ اس کی ساری ہڈیاں چٹخنے لگیں پھر اس نے گوونِدی کے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہنے لگی "چل آج ہم بھی تیرے ساتھ کوئی چھوکرا دیکھیں گے۔ مالتی کے اُٹھتے ہی محفل درہم برہم ہو گئی پانچوں عورتیں اُٹھ کر ڈرائنگ روم کے پاس سے گذریں تو انہوں نے دیکھا کہ مالتی کا شوہر ایک کرسی ڈالے ہمیشہ کی طرح اونگھ رہا ہے۔ اس نے خوب وہسکی پی رکھی ہے۔ بالکل ہوش نہیں ہے۔ اندو نے اس کے کندھوں میں ہاتھ ڈال کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کی مگر وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ مالتی نے حقارت سے اس طرف دیکھا اور پیر پٹختی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔ چھمی نے آگے بڑھ کر مالتی کے شوہر کے پاؤں سے جوتے اتارے۔ سہارا دیکر بستر تک لائی اور لٹا کے اسکی ٹانگیں دبانے لگی۔ مالتی کی غیر حاضری میں وہ دیر تک وہاں بیٹھی رہی آج وہ اپنے کوارٹر بھی نہ جا سکی۔ اس کا شوہر گندی گندی گالیاں بکتا رہا۔ چھمی کے گھر نہ پہنچنے پر جھلاتا ہو گا۔ اس کی آواز یہاں صاف سنائی دیتی تھی پھر یکایک سناٹا چھا گیا۔ شاید مایوس ہو کر وہ کہیں باہر نکل گیا تھا۔ چھمی صبح تک صاحب کی پنڈلیاں ملتی رہی۔ پھر وہ کچھ دیر کے لیئے ان کے پائتیوں سر رکھ کر سو گئی۔

دن کے گیارہ بجے گووندی کی موٹر کا ہارن بجا تو لچھمی نے کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھا گووندی اور مالتی باتیں کرتی ہوئی راہداری سے زینے کی طرف آرہی تھیں۔ گاڑی کے پیچھے سے ہوتا ہوا اس کا شوہر اپنے کوارٹر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

رات ہی رات میں وہ بالکل نچڑ گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اب اس کے ہاتھ لچھمی کو مارنے کے لئے کبھی نہ اُٹھ سکیں گے۔

لچھمی نے آنکھیں مسل کر غور سے دیکھا اور زیرِ لب بڑبڑائی "ڈائن کہیں کی" تب ہی اس کے اندر کوئی دوسری عورت بولی۔

"ڈائن تو سات گھر چھوڑ کر ڈستی ہے"

مکتی

عندلیب چچا کے انتقال پر میری آنکھیں برابر اسے تلاش کرتی رہیں اور وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ اسے دیکھنے کے لئے ایک میں ہی بے چین نہیں تھا بلکہ جتنے بھی لوگ وہاں موجود تھے سب میں اس کی غیر موجودگی کا چرچا مرحوم کی وفات کے چرچے سے زیادہ ہو رہا تھا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ چچا عندلیب کی رُوح بھی اس کی تلاش میں بھٹکتی پھر رہی ہوگی۔ اگر وہ آجاتا تو مرنے والے کو اوّل منزل کرنے کا فریضہ اس کی سپردگی میں دے دیا جاتا اور باقی شرکاء براتیوں کی طرح جنازے سے بے نیاز ہو کر اپنی اپنی گفتگو میں اس طرح محو ہو جاتے کہ "مٹی دیدو" کی آواز ملنے تک کسی کو یہ ہوش بھی نہیں آتا کہ وہ چچا عندلیب کو دفنانے آیا تھا۔

کلمہ پڑھتے ہوئے جب لوگ جنازے کو اٹھا کر قبرستان کی طرف لے چلے تو میں نے پھر ایک نظر مجمع پر ڈالی۔ اس کا اب بھی کہیں پتہ نہ تھا راستے بھر میری نگاہ اِدھر اُدھر بھٹکتی رہی۔ پھر جب ہم قبرستان میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا وہاں ایک کونے میں وہ سہما ہوا خاموش کھڑا تھا۔ ہم لوگ اس کے قریب پہنچے تو وہ آہستہ سے آگے بڑھا، جیب سے رُومال نکال کر سر پر منڈھا اور جنازے کو کاندھے پر لے دو چار قدم ساتھ ہو لیا۔ بقیہ تین کونوں پر بھی اس نے اسی طرح حاضری دی اور پھر سب سے پیچھے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

گورکن سردھا وا کھود چکے تھے۔ ہمیں تدفین کے لئے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مسہری قبر کے سرے پر لگا کر لوگوں نے کمر پٹیا ڈالا تو وہ بھی عادت کے

مطابق ایک سرا پکڑنے کے لئے مستعد ہو پاؤں جما کر سلیّوں پر کھڑا ہو گیا۔ پھر سب نے دیکھا کہ اس کے پاؤں کانپ رہے تھے اور اس میں لاش کو ہاتھوں پر سنبھالنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔

میں اسے برسوں سے جانتا تھا۔ جب کبھی وہ میرے گھر آتا تھا تو اسے دیکھتے ہی میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں جان لیتا تھا کہ آج پھر کسی کا انتقال ہو گیا ہے۔ عید بقرعید، شب براۃ سب یوں ہی گذر جاتے لیکن اسے کبھی توفیق نہ ہوتی تھی کہ دو گھڑی ملاقات کے لئے آجائے۔ شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کے موقعوں پر بھی اس کی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس نے اپنی مصروفیات کی آڑ لے کر عزیز و اقربا ملنے جلنے والوں سے ہمیشہ کے لئے معذرت کر لی تھی۔ وہ ایک بڑے کُنبے کی کفالت کا تنہا ذمے دار تھا اور اسی لئے نہ جانے اس نے کتنے دھندے اپنے پیچھے لگا رکھے تھے۔ صبح سے شام تک دفتر میں سر کھپاتا تھا اور شام کو جب پارٹ ٹائم ملازمتوں سے فارغ ہو کر گھر پہنچتا تو اسے کھانا کھاتے ہی ٹیوشن پر جانا ہوتا تھا۔ رات کے گیارہ بجے تک وہ اس کام میں مصروف رہتا اور پھر اسے مجبوراً اس لئے گھر آنا پڑتا، کہ اس کے بعد اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا ورنہ اگر کہیں رات بھر کی اَسامی اور مل جاتی تو شاید وہ سونے کے مہمل اور بے معنی شغل سے بھی شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کی طرح مکمّل اجتناب کر لیتا۔ اس کی قوت ارادی بڑی مضبوط تھی۔ صبح سے رات تک کولہو کے بیل کی طرح جتتے رہنے کے بعد بھی اس کے چہرے سے تھکن اور پژمردگی کے آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ جسم بھی خاصا لوانا اور گٹھا ہوا تھا جو بس لمحاتی طور پر تو مضمحل ہو جاتا لیکن جب وہ رات کے گیارہ بجے اپنی بیوی کی چارپائی کے قریب دوسری چارپائی پر جا لیٹتا تو دو چار کروٹوں میں ہی اس کی ساری تھکن اُتر جاتی تھی اور گھنٹہ آدھے گھنٹے بعد پھر اس کی چارپائی خالی پڑی پچھلے پہر تک اس کا انتظار کیا کرتی تھی میں نے اس کا نام ملک الموت رکھا تھا۔ سال میں ایک دو بار وہ بڑے میکانکی

انداز میں تیز تیز قدموں سے اوروں کی طرح میرے پاس بھی آتا اور بڑے سپاٹ لہجے میں کسی کے مرنے کی اطلاع بہم پہنچاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ چہرے سے بالکل ہشاش بشاش دکھائی دیتا تھا اور اس کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ لوگ اسی کی طرح مرنیوالے سے ہمدردی کا اظہار کرنے کے بجائے تجہیز و تکفین کی ذمّے داریوں کو سنبھال لیں۔

لوگوں کو اطلاع دینے کے دوران ہی وہ بڑی سرعت کے ساتھ کفن کے لئے، لوبان، کافور گلاب کے ادّھے، ملتانی مٹی، اگربتیوں، تھوڑی سی روئی اور ایک پانچ آنے والی صابن کی ٹکیہ کا انتظام بھی بالکل اسی طرح کرتا تھا جیسے دفتر جانے سے پہلے وہ اپنے گھر کا سودا سلف لاتا تھا۔ یہ انتظام کرتے وقت اسے قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ کا پورا پورا خیال رہتا تھا مثلاً وہ جانتا تھا کہ پچھلی بار جب اس نے لٹھا پھڑوایا تھا تو گلشن کا لٹھا پونے تین روپے گز ملا تھا اور اس مرتبہ وہی لٹھا سوا تین ملا ہے۔ اِس مہنگائی کا ذکر وہ مرنیوالے کی موت کے ذکر کے ساتھ اس طرح کرتا تھا جیسے اس کی اپنی رائے میں مرحوم نے دُنیا سے جانے میں تاخیر کر دی اور اس طرح جو نقصان ہوا اسکی تلافی وہ کچھ عرصے پہلے مرتے تو بخوبی کر سکتے تھے۔

شہر کے تمام عزیزوں کو مرنے کی خبر دے کر لدا پھندا وہ جائے واردات پر لوٹتا تو جلدی جلدی صحن کے ایک گوشے میں چار کمھار اینٹوں کا چولہا بنا کر تانبے کی دیگ میں پانی گرم کرنے کے لئے رکھتا، اور بھاگ کے قریب کی مسجد سے بیری کے پتے اور مسہری لے آتا تھا، ادھر پانی گرم ہوتا اُدھر وہ ہاتھوں پر تھیلیاں چڑھا مٹی کے چار ڈھیلے لے، روتے پیٹتے اقربا کے درمیان سے لاش کو دو چار آدمیوں کی مدد مانگ، نہلانے کے لئے صحن میں گھسیٹ لاتا اور خود ہی غسل کے فرائض انجام دیتا تھا۔ سرہانے لوبان جلا، تہمد سے ستر پوشی کر۔ پہلے چکنی مٹی سے استنجا کراتا، ملتانی سے سر دھوتا، پھر نتھنوں اور کانوں میں روئی کے پھوہے اڑس نیم گرم پانی سے منہ دھلاتا، وضو کراتا اور اس کے بعد دھلا دھل پانی کے لوٹے بھر بھر کے سارے جسم کو اس طرح دھارتا تھا جیسے دایہ نوزائیدہ بچے کے جسم کو دھارتی ہے نہلا دُھلا کے کفن پہناتا اور جنازے کو عطر اور کافور

میں بسا، مٹھا کس، مسہری پر لٹا کلمہ کی سبز چادر اُڑھا دیتا تھا۔

میّت سے اس کا پہلا سابقہ اس وقت پڑا جب اس کے بابا کا انتقال ہوا تھا۔ وہ چھ سات برس کا ہوگا اور کمیٹی کے اسکول کی دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس کا باپ بھی اس کی طرح غریب آدمی تھا اور ایک نرینہ اولاد کے لیئے چھ لڑکیوں کی ذمّہ داری اس نے اپنے سر لے لی تھی وہ زندگی بھر مفلسی اور اس سے متعلق مصائب کا شکار رہا تھا اور مرنے کے بعد پہلی مرتبہ اس کا جھریوں بھرا چہرہ پرسکون اور شاداب دکھائی دیا تھا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس روز جب وہ اسکول سے لوٹ کر گھر آیا تھا تو اس نے اپنی ماں اور بڑی بہنوں کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ خود بھی بہت گھبرا گیا تھا اور اس نے کوشش کی تھی کہ وہ بھی رونے میں ان کا ساتھ دے سکے لیکن اس کی آنکھیں رات بھر جلے ہوئے دیئے کی طرح خشک پڑی رہیں پھر کچھ رشتہ داروں اور محلّے کی بڑی بوڑھیوں نے اسے گلے لگا کر خوب آنسو بہائے تھے اور وہ حیران حیران سب کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی لاش بھی دیکھی تھی اور اسے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی تھی کہ اس کا باپ ہمیشہ کی طرح اسے ڈانٹنے پھٹکارنے کی بجائے اس کی طرف شفقت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے زندگی بھر اپنے باپ کو اتنا خاموش اور اتنا مطمین پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

گھر میں تیز لوبان کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی وہ اپنے باپ کو اُجلے سفید کپڑوں میں دیکھ کر اتنا خوش ہوا تھا کہ آہستہ آہستہ مسہری کے بالکل قریب آگیا اور لٹّھے کی سفید چادر کو اس نے اپنی نرم نرم انگلیوں سے چھو کر دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ پھر جب کسی نے گود میں اُٹھا کر اسے بھینچ لیا تو اسے بڑا غصّہ آیا تھا۔ اسے یہ سب کچھ اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ اس کا جی چاہا کہ گھر میں اس قسم کی چہل پہل روز دکھائی دیا کرے۔

اس کے باپ کی شادی ہوئی تھی تو وہ پندرہ روپے ماہوار کا ملازم تھا یہ ان دنوں کی بات ہے جب روپے کا سولہ سیر اناج اور سوا سیر دیسی گھی ملتا تھا۔ باپ نے شروع شروع خاصے اچھے دن گذارے تھے پھر ادھر اس پر تابڑ توڑ اولادوں نے فوج کشی کر دی اور ادھر دوسری جنگ عظیم نے اسکو موس کر قلاش کر دیا۔ ان دو آفتوں نے اس کے باپ کے ایسے حواس کھوئے کہ پھر وہ جیتے جی ہوش میں نہ آسکا اور یہ پریشانیاں ایک دن اس کی جان لے کر ٹلیں۔

وہ بزدل اور کم ہمت آدمی نہیں تھا۔ اس لئے باپ کے مرنے کے بعد اس نے کسی نہ کسی طرح میٹرک بھی پاس کر لیا اور سرکاری ملازمت بھی حاصل کی۔ اپنی ماں اور چھ بہن بھائی بہنوں کا بوجھ بھی اُٹھا لیا اور قرض مام کر کے انہیں اپنے اپنے گھر رخصت کیا۔ ماں یہ سب کچھ تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھتی رہی اور بالآخر خوشی سے ایک دن مر گئی۔ اس نے اپنی خالہ زاد بہن سے شادی کی تھی اور جب اس واقع کو سات سال بیت گئے تو اس نے دیکھا کہ اس کا باپ اس کے اندر جی اُٹھا ہے۔ مگر وہ اس جنم میں روتا ہیٹیا، تھکا ہارا، پژمردہ سا انسان نہیں تھا بلکہ اس میں زمانے کی مصیبتوں سے ٹکرانے کا دم خم موجود تھا۔ وہ اپنی چھ بیٹیوں اور ایک لڑکے کی ذمہ داریاں اسی خندہ پیشانی سے اٹھا رہا تھا جس خندہ پیشانی سے خدا اپنی مخلوق کو پالتا ہے۔

ایک دن جب وہ دفتر جاتے ہوئے ریلوے لائن پار کر رہا تھا تو اس نے ایک کٹی ہوئی لاش دیکھی۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ایسے حادثے اکثر اس کے سامنے پیش آتے رہتے تھے اور وہ ان کی پرواہ کئے بغیر بڑے انہماک سے زندگی گذار رہا تھا۔ موت اس کے لئے کوئی تکلیف دہ بات نہیں تھی۔ بس ایک طویل نیند تھی جس میں ممکن ہے کچھ حسین خواب بھی دکھائی دیتے ہوں اور ان لوگوں سے ملاقات بھی ہوتی ہو جو اس سے پہلے اس سے بہتر زندگی گذار چکے تھے مگر نہ جانے کیوں اس لاش کو دیکھ کر وہ گم سم ہو گیا تھا اور دیر تک اسی مقام پر کھڑا رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ لاش تھوڑی دیر کے لئے بولنے لگے اور وہ اس کے کچلے ہوئے منہ سے اس کی درد بھری داستان سُنے پھر یکبارگی اسے ایک اور

خیال آیا۔ وہ سوچنے لگا۔ جذباتی لوگ عشق میں بھی تو خودکشی کر لیتے ہیں، یہ لاش کسی عاشق کی لاش تو نہیں ہے، پھر عشقیہ افسانے ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں چکر لگانے لگے۔ لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال، شیریں فرہاد، لاش اور اس کی محبوبہ۔ لاش کی نیازمندی جان سپاری، محبوبہ کے جور و ستم، غفلت شعاری۔ وہ دیر تک عشق اور اس کے عواقب پر بڑی سنجیدگی سے غور کرتا رہا۔ اور کسی نتیجے پر پہنچے بغیر اپنے دفتر پہنچ گیا۔ اسے مہمل خیالات سے چڑ تھی اس لئے اپنے تئیں دو چار صلواتیں سنا وہ ٹیبل پر بکھرے ہوئے فائلوں میں کھو گیا۔

صفحات پلٹنے لگے۔ اس نے دیکھا کہ اس کے مکان سے متصل ایک اور مکان ہے۔ قدسیہ اسی مکان میں رہتی تھی۔ اس کا باپ کسی کارخانے میں ایک معمولی مزدور تھا۔ قدسیہ ایک سمجھدار اور متوازن قسم کی لڑکی تھی۔ وہ ان دنوں عین شباب کے عالم سے گذر رہا تھا اور قدسیہ کی بھی اٹھتی جوانی تھی۔ اسے قدسیہ سے نہ جانے کیوں عشق ہو گیا۔ عشق کے بارے میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ دونوں مکانوں کی درمیانی دیوار بارش سیلاب یا زلزلوں کی نذر ہو جائے اور قدسیہ اسے اپنے آنگن میں پھرتی دکھائی دینے لگے مگر ایسا نہ ہو سکا دعائیں مانگنے تو قدرتی بلائیں بھی نازل نہیں ہوتیں۔ پھر اس کی منجھلی بہن قدسیہ کی طرح جوان ہو گئی اور اسے برے برے خواب دکھائی دینے لگے، ماں بڑی ملتجیانہ نظروں سے اسکی طرف دیکھتی تھی جیسے ان ڈراونے خوابوں کا علاج اس کی اپنی جیب میں ہو۔ اس نے کئی اور ٹیوشن بڑھا دیئے۔ دفتر میں بھی اوور ٹائم کرنے لگا۔ اور ان مصروفیات میں قدسیہ کا خیال اس کے الجھے ہوئے ذہن سے نہ جانے کب ایک دم نکل گیا۔ پھر جب وہ اپنی منجھلی بہن کو وداع کرنے کے لئے مہاجن کی مدد حاصل کرنے گیا تو قدسیہ کے باپ کو وہاں دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ ان دونوں مکانوں کے بیچ کی دیوار آسمان کی طرح ناقابلِ تسخیر بلندیوں تک پہنچ گئی ہے۔

اس روز تمام دن اس کی نگاہ میں کچلی ہوئی لاش کا تصور بندھا رہا۔ اس نے سوچا کہ مرنے والا بڑا غریب آدمی ہوگا مگر غریب تو وہ خود بھی تھا اور اس نے خودکشی کے بارے میں کبھی بھول کر بھی نہ سوچا تھا زندگی کے دکھ سکھ بھوگنے کے لئے ہی آدمی کو پیدا کیا جاتا ہے۔

اسے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے ۔ ایسا اس کا خیال تھا۔ پھر وہ خودکشی کے دوسرے اسباب پر غور کرنے لگا اور نہ جانے کہاں سے قدسیہ اس کے ذہن میں آن گھسی بھولی بھالی خاموش سی لڑکی جس نے خود کو محرومیوں کے حوالے کردیا تھا۔ ایسی محرومیاں جن کا اب زندگی بھر خاتمہ نہیں ہوگا۔ وہ سوچنے لگا ایک خودکشی تو اس نے اپنے آپ بھی کی ہے اور اس خیال کے ساتھ ہی یکایک لاش کا کریہہ منظر اس کے حواس پر حاوی ہوگیا تھا۔

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ آج وہ اوور ٹائم کے موڈ میں نہیں تھا اس نے فائل میز پر سمیٹ کر رکھ دئے اور چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کی سائیکل خیبر پاس راج پور روڈ سے گذرتی ہوئی مال روڈ تک آگئی مگر اس کی شدھ بدھ واپس نہیں آئی تھی۔ وہ ایک پُرانی عادت کے تحت سائیکل پر توازن قائم کئے ہوئے تھا اور اس کے پاؤں خود بخود پیڈل کے محور پر تیزی سے گردش کر رہے تھے۔

بڑے زور سے بریک لگے اور بڑی سی شوفلے گاڑی بالکل اس کے سر پر آن کھڑی ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ سائیکل سے گر گیا ہے۔ ڈرائیور نے غصہ میں کھڑکی سے منہ نکال کر دو چار گالیاں دیں اور اسٹیرنگ گھما تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ موت اس کے سر پہ منڈلا کے گذر گئی تھی۔ وہ موت سے خائف نہیں تھا۔ مگر نہ جانے کیوں اُسے اپنے بچ جانے پر بے حد خوشی ہوئی تھی۔

اس واقع کے بعد وہ کئی دن تک پریشان رہا لیکن اس نے گھر میں اس لئے کسی سے ذکر نہیں کیا کہ ناحق بیوی اور بچے بھی اس کے ساتھ پریشان ہوں گے۔ اسی اثناء میں بیچارے چچا عندلیب گذر گئے وہ باوجود انتہائی کوشش کے خود کو ان کی لاش پر آنے کے لئے آمادہ نہ کرسکا۔ ایک انجانے احساس نے اس کے قدم پکڑ لئے تھے۔ پھر جب وہ کسی نہ کسی طرح اپنی طبیعت پر جبر کر کے قبرستان پہنچ گیا تو اس کے اعضاء نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ چچا عندلیب کو قبر میں اترواتے ہوئے وہ کانپنے لگا تو اسے بڑی خفت ہوئی تھی، اس لئے نہیں کہ لوگ کیا کہیں گے بلکہ اس لئے کہ اپنی دانست میں وہ ان کا حق ادا نہ کرسکا تھا اور اس سے مرحوم کی آخری خدمت میں کوتاہی ہوئی تھی۔

کچھ دن بعد آخر اس نے بیوی کو اس حادثے کی اطلاع دیدی ۔ وہ خوف سے بیری کی طرح کانپنے لگی تھی پھر اس نے ایک حسرت ناک نگاہ سے شوہر کی طرف دیکھا تھا اور اس کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے ۔ اس کی نظر میں اپنی مرحوم ماں کا نقشہ پھر گیا جس کی آنکھیں باپ کی وفات سے اپنے مرنے کے وقت تک ساون بھادوں کی طرح برستی رہی تھیں ۔

اس نے بیوی کو دلاسا دینے کی بھی کوشش کی تھی مگر اب اس کی آواز میں پہلا سا اعتماد نہیں رہا تھا ۔ بیوی چھپی چھپی نظروں سے ایک ٹک اسے گھور رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے شوہر کی نگہداشت کر رہی ہو ۔ اس رات اس کی بیوی نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور کٹور دان میں بچا ہوا سالن اور چنگیر کی تمام روٹیاں غالباً کسی کو خیرات کر دی تھیں خدا کے حضور میں پیش کرنے کے لئے اس غریب کے پاس چند آنسو اور بچے کھچے کھانے کے علاوہ کوئی اور نذرانہ نہیں تھا اسے اپنی محرومیوں کا احساس پہلی مرتبہ اُسی روز ہوا تھا اور وہ ٹیوشن پر جانے کے بجائے اوّل رات سے ہی بستر پر دراز ہو کر بڑی دیر تک خلا میں گھورتا رہا تھا ۔

اِس کے قویٰ مضمحل ہونے لگے اور ذرا دیر میں اس کا توانا جسم ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گیا ۔ وہ اپنی موت کے اِمکانات پر غور کر رہا تھا ۔ اس کا لڑکا اسکول کی تعلیم سے ابھی فارغ نہیں ہوا تھا ۔ دو لڑکیاں جوان ہو کر کسی مناسب رشتے کے انتظار میں سوکھ رہی تھیں ۔ شہر کے تمام اچھے لڑکے دان دہیز کے متلاشی تھے ۔ مشّاطہ بھولے بھٹکے کبھی کوئی پیغام لے آتی تو گھر کے چار کونوں کو آنکھوں آنکھوں میں ٹٹول یوں واپس چلی جاتی تھی جیسے اس کے بٹن جیسے دیدوں کو وہاں دو جوان لڑکیاں ہی نہ سُوجھی ہوں ۔ اس نے اپنی بہنوں کی شادیاں بھی انہیں حالات میں کی تھیں مگر وہ زمانہ اور تھا ۔ اس کی ماں نے کچھ تج اور سلیقہ کر کے چولہے آگے کے دو چار برتن اور چند جوڑے ہر بہن کے لئے تیار کر لئے تھے بس اسی میں لوگ خوشی خوشی انہیں بیاہ کر لے گئے ۔ اب وہ بات نہیں تھی ۔ مہنگائی جنگل کی آگ کی طرح دِن بدن بڑھ رہی تھی اور اس مہنگائی میں جو کچھ اسکی

بیوی نے اپنی لڑکیوں کے لیئے کر رکھا تھا وہ کسی کی آنکھ میں چھپا نہیں تھا۔ وہ خود بھی دن رات اس دُھن میں لگا رہتا تھا کہ کہیں سے اپنی آمدنی کو دوگنا چوگنا کر لے مگر بے روزگاری کا بڑھتا ہوا سیلاب اس کی کوششوں کو بے جان تنکے کی طرح بہا کر لے جاتا تھا۔ اپنے دفتر میں اس نے ایک ایک اسامی کے لیئے ہزاروں درخواستیں آتی دیکھی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ ان دنوں ہر کام سفارش یا رشوت سے ہوتا ہے۔ اسے پچھلے مہینے کا واقعہ یاد آیا جب ایک بی۔ اے پاس نوجوان نے اپنی بہن کو اپنے افسر کے پاس سفارش کے لیئے بھیجا تھا۔ پھر نہ جانے کتنے روتے بسورتے ضرورتمند بھوکے چہرے اس کی خلا میں گھورتی ہوئی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ یکایک اسے ان چہروں کے درمیان اپنے جوان بیٹے کا چہرہ بھی دکھائی دیا اس نے گھبرا کے آنکھیں بند کر لیں۔

اسے نیند نہ آئی اور جب اس کی بیوی پچھلے پہر تک اس کا انتظار کر کے سوگئی تو وہ چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور تمام گھر کا جائزہ لینے لگا۔ سامنے ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر دونوں جوان بیٹیاں سانپنوں کی طرح کنڈلیاں مارے ایک ساتھ سو رہی تھیں۔ چھوٹی لڑکی ماں کی بغل میں اور اس سے بڑی پائنتیوں لیٹی ہوئی تھی۔ دو لڑکیاں اس کے اپنے بستر پر آڑی ترچھی پڑی تھیں اور اس کا اکلوتا لڑکا اس سے کچھ فاصلے پر خراٹے لے رہا تھا۔

بڑے زور سے بریک لگے اور بڑی سی شور لے گاڑی بالکل اس کے سر پر آن کھڑی ہوئی۔ ڈرائیور نے غصّہ میں کھڑکی سے منہ نکال کر دو چار گالیاں دیں اور اسٹیرنگ گھما تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

وہ بستر سے اُٹھا اور دبے پاؤں اپنے لڑکے کے سرہانے جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے جُھک کر اس کی پیشانی چومی اور خاموشی سے واپس آکر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد اسے ایک گہری اور کبھی نہ ٹوٹنے والی نیند نے ہمیشہ کے لیئے سُلا دیا تھا۔

ڈاکٹر محمد حسن ، پروفیسر ایمی ریٹس جواہر لال نہرو یونیورسٹی ۔ نئی دہلی

پچھلے دنوں جو نیا نام اُردو افسانے میں اُبھرا ہے وہ سید ضمیر حسن دہلوی کا ہے ۔ ضمیر دہلی کی چٹخارے دار زبان کے عاشق ہیں ۔ پرانی دہلی کی گلیاں ، ان کی رنگین زندگی اور اس کی تہذیبی چہل پہل کے شیفتہ ہیں ۔ اسی لئے افسانے کے کوچے میں انشائیے کے ذریعہ داخل ہوئے پھر کردار نگاری کی طرف رُخ کیا اور "انگنا کہار" جیسے اچھے کردار کی تخلیق کی ۔ افسانے میں ضمیر نے ایک نئی تہہ داری پیدا کی جو "ستوانسے شہزادے" اور "موہنا" میں ابھر کر سامنے آئی ۔ موہنا یوں تو کبوتروں کے ایک جوڑے کی کہانی ہے مگر اس کے ذریعہ ایک ڈھلتی عمر کی عورت کی جنسی اور جذباتی تشنگی کی پوری داستان سامنے آجاتی ہے ۔ ضمیر حسن نے ہماری تہذیبی قدروں پر استفہامیہ نشان بھی لگائے ہیں ۔ ان کی کہانیوں میں اندازِ بیان کا رچاؤ اور تہذیبی جائزے کی مدد سے فکر کی نئی سطحوں تک پہنچنے کی نہایت حسن کارانہ کوشش کی گئی ہے ۔

سید ضمیر حسن دہلوی کے افسانے ایک نئی جہت کی نشاندہی کرتے ہیں ان کے افسانوں میں بنیادی کہانی کو دوسری زیادہ بلیغ کہانی کا پس منظر بنا کر پیش کیا جاتا ہے ۔ یہ فن کاری "موہنا" میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اور اس تہہ داری سے اُردو افسانے کا ایک نیا کالبد بنتا ہے ۔

ڈاکٹر محمد حسن

پروفیسر قمر رئیس ، یونیورسٹی آف دہلی

سید ضمیر حسن دہلوی کے افسانوں میں پرانی دلی کے مخصوص کردار اور رسم و رواج سانس لیتے ہیں اور اپنے ساتھ پرانے ماحول کو بھی زندہ کر دیتے ہیں لیکن انکی کہانی کا اصل جوہر ان کی دہلوی زبان ، روزمرہ اور شگفتہ اسلوب ہے جو قاری کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے ۔ ان کے افسانوں میں دلی کی مخصوص فضا ملے گی اور اس کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کی گہری انسانی ہمدردی بھی نمایاں نظر آئے گی ۔

(ڈاکٹر قمر رئیس)

ڈاکٹر نصیر احمد خاں، جواہر لال نہرو یونیورسٹی۔ نئی دہلی۔

ضمیر حسن دہلوی نے بڑی گداز طبیعت پائی ہے۔ ان کے مزاج میں رچاؤ اور لہجے میں شوخی ہے۔ وہ موضوع کو افتادِ طبع سے دیکھتے اور مزاج کی داخلیت سے محسوس کرتے ہیں۔ دہلی کی زندگی کو دہلوی انداز میں پیش کرنا اور چھوٹے چھوٹے برجستہ بلیغ اشاروں سے ان میں جان ڈال دینا ضمیر حسن کا کمال ہے۔ حقیقت کا اظہار، شخصی ردِعمل، زبان و بیان کا بانکپن ان کے افسانوں کی خصوصیات ہیں۔

ڈاکٹر نصیر احمد

ڈاکٹر مظفر حنفی، کلکتہ یونیورسٹی۔ کلکتہ

عصر حاضر میں ضمیر حسن دہلوی کی تخلیقات پڑھ کر تسکین ہوتی ہے کہ ابھی کچھ لوگ ایسے باقی ہیں جنہیں دہلی کی ٹکسالی زبان، روزمرّہ اور لہجے پر قدرت حاصل ہے اور وہ اپنی اس مہارت کا مظاہرہ گفتگو سے ہٹ کر تحریر میں بھی کر سکتے ہیں۔ موصوف کی تحریر کا بے تکلفانہ انداز اور معنویت کی زیریں لہر انہیں مزید انفرادیت بخشتے ہیں۔

ڈاکٹر مظفر حنفی

معذرت

میں نے دلی کی شہر آبادی تو کیا اس کی پرچھائیاں بھی نہیں دیکھیں جو کچھ اگلے لوگوں سے سنا وہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔ بزرگوں کے جو کلمات خوبیٔ تقدیر سے آویزۂ گوش ہوئے انھیں دل کے نہاں خانوں میں یوں سمو لیا جیسے پھول کی پتیاں خوشبو کو سموتی ہیں یا ارگنوں کے پردے میں موسیقی کے سُر سما جاتے ہیں۔ اس اوچھی پونجی پر میں یہ کہوں کہ میں نے دلیؔ کی تہذیب کا ان کہانیوں میں چرچا کیا ہے تو یہ مجھے زیب نہیں دیتا میں کیا اور میری بساط کیا ننگی کیا نہائے گی، کیا نچوڑے گی۔

احباب میرے اکثر مجھ سے کہتے ہیں کہ تو دلیؔ کی زبان بولتا ہے لہجے میں کوثر و تسنیم کی روانی اور قند و نبات کی مٹھاس ہے میں بھلا اس ضمن میں کیا عرض کروں "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" اسے الطافِ رحمانی سے تعبیر کروں تو بجا ہے اور فیضانِ خاکِ پاکِ دہلی کا کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔"

سید ضمیر حسن دہلوی